اس کا دوسرا اڈیشن شائع کیا ہے، اس میں اتنے اضافے ہوگئے ہیں، کہ اس کی ہیئت ہی بدل گئی ہے، وہ پہلے اڈیشن سے اس کو کوئی مناسبت نہیں رہ گئی، اس کا حجم دونے سے بھی زیادہ بڑھ گیا ہے، اس کتاب میں معتبر اور مستند ماخذوں سے غالب کے سوانح حالات اور اخلاق و عادات تحریر کئے گئے ہیں، اور ان کی تصانیف پر محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے، اور ادھر چند برسوں میں غالب کے متعلق جس قدر نئے معلومات حاصل ہوئے ہیں، ان سب کا خلاصہ اور عطر آگیا ہے، غالب پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں اختصار اور جامعیت کے لحاظ سے یہ کتاب امتیازی حیثیت رکھتی ہے، فاضل مؤلف ایک نکتہ سنج ادیب اور پختہ کار اہل قلم ہیں، اس لئے اُن کا طرزِ تحریر نہایت شگفتہ دلچسپ اور دلپذیر ہے، اُن کی اس تالیف سے غالبیات میں ایک قابلِ قدر کتاب کا اضافہ ہوا، اور وہ اصحابِ ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے،

کرنول کے تاجدار از جناب جی ام خان ام اے عثمانیہ تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۸ صفحے کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت مرتبہ: - مینیجر ہندوستانی ادب ۱۱-۵-۹۹ اعظم پورہ شرقی حیدرآباد دکن

تیموری حکومت کے زوال کے زمانہ میں دکن میں جو چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوئی تھیں، ان میں ایک ریاست کرنول (مدراس) بھی تھی، اس کو داؤد خان صوبہ دار نے اٹھارہویں صدی کے شروع میں قائم کیا تھا، اور تقریباً انیسویں صدی کے وسط میں انگریزوں نے اُس کے آخری فرمانروا نواب غلام رسول خان پر جھوٹے الزامات لگا کر اس کا خاتمہ کیا، اور اُن کے ورثہ کے ساتھ بھی اچھا سلوک نہیں کیا، اس کتاب میں سرکاری دستاویزوں اور انگریز حکام کی تحریروں سے ریاست کرنول کے مظلومانہ خاتمہ اور خاندان کرنول کے ساتھ انگریزوں کی بدسلوکی کے حالات تحریر کئے گئے ہیں، مصنف غالباً ابھی نوآموز ہیں، اس لئے تحریر میں بڑی خامیاں ہیں، گو اب ان واقعات کی حیثیت داستانِ پارینہ سے زیادہ نہیں ہے، تاہم اس سے ایک تاریخی واقعہ اردو میں محفوظ ہوگیا

"م"

جلد ۶۷ ماہ رمضان المبارک ۱۳۷۰ھ مطابق ماہ جون ۱۹۵۱ء عدد ۶

مضامین

شذرات

ہان ہان جبھی تو چشمِ جنون اشکبار ہے
شاید جہان سے حسرتِ دیوانہ چل بسا

بالآخر کئی مہینہ کی موت وحیات کی کشمکش کے بعد ہمارے قافلۂ آزادی کا پہلا حدی خوان اور میر کاروان بھی کوچ کر گیا اور گلستانِ تغزل کا بلبلِ نغمہ سنج ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا یعنی گذشتہ ۱۳ مئی کو سید الاحرار مولانا فضل الحسن حسرت موہانی نے اس دارِ فانی کو الوداع کہا کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ وَیَبْقیٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِکْرَام،

مولانا حسرت کی ذات ستودہ صفات مجموعۂ اضداد و کمالات تھی، وہ ملک و وطن کے جانباز مجاہد بھی تھے اور شاعرِ رنگین نوا بھی، انقلابی سوشلسٹ بھی تھے اور صاحبِ وجد و حال صوفی بھی، بوریہ نشینِ فقر و مسکنت بھی، اور مسند نشینِ عز و تمکنت بھی، انہون نے اس زمانہ مین انگریزون کی مخالفت کی صدا بلند کی، جب اسکی پاداش دار و رسن تھی، اس زمانہ مین آزادی کا صور پھونکا جب کانگریس بھی اس نام سے گھبراتی تھی، اور بڑے بڑے محبِ وطن آزادی کے کھلونون مین الجھے ہوئے تھے، اور اس زمانہ مین قوم و ملک کے لئے قید و بند کی مصیبتین جھیلین جب جیل سیاسی تفریح گاہ نہین بلکہ حقیقۃً قید محن تھے، انہون نے اس راہ مین جو قربانیان کین اور جتنے مصائب اٹھائے اسکی مثال اُس زمانہ کے کسی لیڈر کی زندگی مین مشکل ہی سے ملسکتی ہے، اور موجودہ مدعیانِ آزادی کو تو آزادی کا شعور و احساس بھی نہین تھا، بلکہ حق یہ ہے کہ گاندھی جی بھی ایک عرصہ تک اس راہ مین ان سے بہت پیچھے رہے اور حسرت کا یہ دعوی اوّلیت بالکل صحیح ہے،

تو نے کی حسرت عیان تہذیبِ رسمِ عاشقی
اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا

وہ اخلاص و صداقت حق گوئی و حق پرستی اور جرأت و بیباکی کے جس درجہ پر تھے، اس مین ریا، نفاق اور مصلحت اندیشی

کا کہین گذر نہ تھا، اور اپنے خیالات مین اتنے پختہ اور متشدد تھے کہ اس مین ادنی لچک بھی گوارا نہ تھی، اُن کی بعض رائین بھی عام رایون سے الگ اور نرالی ہوتی تھین، اس لئے وہ موجودہ پرفریب سیاست کے ساتھ نہ چل سکے، اور نہ سیاست فروش لیڈرون کی طرح کوئی دنیاوی جاہ و منصب حاصل کر سکے، لیکن اُن کے کردار و سیرت کا اثر موافقین و مخالفین سب پر تھا، اور ہر دل مین انکی عزت و وقعت تھی، اور وہ ابتدا سے کانگریس کے سرگرم رکن اور آزادی کی تحریک مین اتنا آگے تھے کہ کانگریس بھی انکا ساتھ نہ دیسکتی تھی، مگر ادھر چند برسون سے وہ اسکی فرقہ پرستی سے بددل ہو کر لیگ مین شامل ہو گئے تھے، مگر اس وقت بھی ان کے خیالات کی شدت مین کوئی فرق نہین آیا تھا چنانچہ لیگ مین آزادیِ کامل کا ریزولیشن زیادہ تر انہی کی کوشش سے پاس ہوا تھا، قائد اعظم اپنی خود رائی اور نزاکتِ مزاج کے باوجود مولانا کا بڑا احترام اور انکے اخلاص و صداقت کی بڑی قدر کرتے تھے، انکا یہ کردار بھی لائق ستائش ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کے بعد انہون نے حصولِ جاہ کے لئے پاکستان کی راہ نہین لی، بلکہ ہندوستان مین رہ کر مسلمانون کے درد دکھ مین برابر کے شریک رہے، اُن کے خیالات مین بڑی اُپج تھی، انہون نے ایک اسلامی کمیونزم ایجاد کی تھی، جسکے بڑے مبلغ تھے، ابھی چند سال ہوئے اعظم گڈہ آئے تھے تو دار المصنفین بھی تشریف لائے اور اسلامی کمیونزم کو سمجھانے کی کوشش کی تھی، اور اس سے متعلق اپنی ایک نظم بھی سنائی تھی، اس سلسلہ مین دو ادبی لطائف یاد رہ گئے، ایک یہ کہ سوویٹ اسلامی سوویت (مساوات) سے اور کامریڈ اخوت سے ماخوذ ہے۔

خارزارِ سیاست کی اس رہ نوردی کے ساتھ وہ اس دور کے سب سے بڑے غزل گو تھے اور آخری دور کے بگڑے ہوئے مذاقِ شاعری کی اصلاح انہی نے کی، اور بے لطف رسمی تغزل کو صحیح معنون مین دل کی واردات بنا دیا جس مین حقیقی تغزل کی ساری لطافتین اور رعنائیان موجود تھین، اس لحاظ سے وہ اردو غزل کے مصلح و مجدد تھے اور انہین یکتائی کا یہ دعوی بالکل صحیح تھا،

حسرت مرے کلام مین مومن کے رنگ مین
ملکِ سخن مین مجھ سا کوئی دوسرا نہین

شاعری کے علاوہ انہون نے دوسرے ادبی پہلوؤن سے بھی اردو زبان کی بڑی خدمت کی ایک زمانہ مین اُن کا

رسالہ اردوے معلّٰی اردو کا سب سے ممتاز رسالہ تھا، اور اردو کی خدمت میں اس کا کوئی حریف نہ تھا مگر اب وہ ایک عرصہ سے قریب قریب بند ہوگیا تھا، تاہم چند سال پہلے تک کبھی کبھی اس کا کوئی نمبر نکل آتا تھا، جس میں زیادہ تر ان قدیم اساتذہ کے کلام کا انتخاب ہوتا تھا، جن کے دیوان اب تک نہیں چھپ سکے ہیں، اس طرح انھوں نے سیکڑوں پرانے اساتذہ کے کلام کا معتدبہ حصہ محفوظ کر دیا، جو اردو زبان کی بڑی خدمت ہے،

———— ———

مولانا کے پاس شعراء کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ دواوین اور تذکروں کا نہایت عمدہ ذخیرہ تھا، جو مشکل سے کسی ایک جگہ مل سکتا ہے، گذشتہ آمد کے موقع پر میں نے پوچھا مولانا آپکے بعد یہ ذخیرہ کیا ہوگا، جواب دیا جو اہل ہوگا وہ لے لیگا، میں نے عرض کیا ہم لوگوں سے زیادہ کون اہل ہوگا، ہنس کے فرمایا تم ہی لوگ لے لینا، مولانا کے ورثہ کو چاہیئے کہ وہ اس قیمتی ذخیرہ کو ضائع نہ ہونے دیں، مرحوم کی ادبی یادگاروں میں اُن کے مطبوعہ دواوین اردوے معلّٰی کے مضامین، بعض اساتذہ کے مرتب و شائع کردہ دیوان، قدیم اساتذہ کے کلام کا انتخاب اور دیوان غالب کی شرح ہے، خیال ہے کہ ان کے علاوہ کچھ غیر مطبوعہ یادگاریں بھی ہوں گی جن کی اشاعت کا انتظام اُن کے ورثہ اور دوسرے علم دوست اصحاب کو کرنا چاہیئے،

———— ———

ذاتی حیثیت سے مولانا اخلاق و شرافت اور سادگی و تواضع کا پیکر تھے، ان کی زندگی بڑی درویشانہ اور مجاہدانہ تھی، سادگی و مساوات کی حد تک وہ عملاً کمیونسٹ اور شان استغنا، و بے نیازی اور فقر و درویشی میں مرد قلندر تھے، عقیدۃً خوش عقیدہ اور صوفی مشرب تھے، حضرت مولانا عبدالوہاب فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے، قوالی و سماع سے بڑا ذوق تھا، اپنے سلسلہ کے بزرگوں کے عرسوں میں بڑی پابندی سے شریک ہوتے تھے، انتقال بھی مرشد ہی کے آستانہ فرنگی محل میں ہوا اور انھی کے زیر سایہ باغ مولانا انوار میں آسودہ خواب ہوئے، اور اُن کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی،

گرد پیرِ مغان تھا میں یہان تک حسرتؔ کہ فنا ہو کے بھی خاکِ درِ میخانہ ہوا

اللہ تعالیٰ اس گرد پیرِ مغان کو کوثر و تسنیم کی شرابِ طہور سے نوازے،

———— ———

مقالات

اردو املا کی تاریخ

از جناب ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان صاحب ایم اے، ال ال بی، پی ایچ، ڈی،
(لکچرار اردو کالج کراچی)

املا در اصل لفظوں میں صحیح صحیح حرفوں کے استعمال کا نام ہے، اور جو طریقہ ان حرفوں کے لکھنے کے لئے اختیار کیا جاتا ہے، وہ رسم خط کہلاتا ہے، لیکن ان دونوں کی حدیں چونکہ قریب قریب ہیں، اس لئے فنِ املا کا امام ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے لفظوں کی صحیح تصویر کھینچنے کو املا کہا ہے[۵۱]، اور تقریباً یہی مفہوم انشاء اللہ خان انشاء اور غالب کے یہان پایا جاتا ہے،

حقیقت یہ ہے کہ ہر زبان کے لئے صحیح املا کے قواعد نہایت ضروری ہیں لیکن یہ جس قدر ضروری ہیں اُتنی ہی اُن سے بے اعتنائی برتی جاتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک لفظ ایک شخص جس طرح سے لکھ دیتا ہے وہ دوسروں کے لئے سند بن جاتا ہے، اور جہان کتابوں یا اخباروں میں اس کی تکرار ہوئی، وہ مقبولیت حاصل کرلیتا ہے، اس لئے محققین کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ زبان کی یکرنگی اور یکسانی کو قائم رکھنے کے لئے صحیح بنیادوں پر املا کے اصول قائم کریں تاکہ بے ضابطگی بھی پیدا نہ ہو، اور ہر شخص آسانی سے اپنی زبان لکھ پڑھ سکے،

اس مضمون میں یہ عرض کیا گیا ہے کہ کس زمانہ میں کون سے حروف کس طرح سے لکھے جاتے تھے، اور ان میں کیا کیا تبدیلیاں ہوتی رہیں، چنانچہ اسکے لئے معلومات نہ صرف مطبوعہ کتابوں سے بلکہ نادر مخطوطات سے بھی حاصل

[۵۱] رسالہ اردو جولائی ۳۸ء ص ۲۹۵،

لی گئی ہین، اور کوشش کی گئی ہے کہ صحیح صحیح چیزین نظر کے سامنے آجائین، تاکہ ہمارے محققین کچھ اسلاف کے اختیار کردہ اصول سے اور کچھ اپنے اجتہاد سے املا کے صحیح قاعدے منضبط کر سکین، مولوی عبدالحق صاحب کے ذاتی کتب خانے مین فخرالدین نظامی دکنی کی ایک مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے نام سے موجود ہے، یہ ۸۲۵ھ مین مرتب ہوئی[1]، اس کا شمار قدیم ترین اردو تصانیف مین ہو سکتا ہے، مثنوی نسخ مین ہے، اور اس طرح شروع ہوتی ہے،

کپا ین تھیں ایک دُنہ جگ ادار   بردبرد نہ جگہ تھین دَین ہار

(مالک) (سا) (آسرا) (برابر) (دینے والا)

اکاس اُنچہ پاتال دھرتی تھین   جہان کچھ نکوئی ستھان ہو تھین

(آسمان)

رَہَن ہار اُنگھے رَچنہار تون   رہن ہار پچھیں رہن ہار تون

(خالق) (آگے) (باقی رہنے والا)

تھین رَچیا جگہ ابر اور تال تل   اوپر تھین نہ آکر سکی آپ بل

قلم کیا ین سون تین لکھیا بھوگ جگہ   بکا یا قلم بجاگ لکہ جرم لک

(الکتاب) (نصیب)

اس مخطوطے کی املائی خصوصیات یہ ہین،

۱- گاف پر ایک ہی مرکز ہے، اور اکثر اس کے نیچے تین نقطے ہین،

۲- جب گاف اور جیم کسی لفظ کے آخر مین آتا ہے، تو اس کے ساتھ لا بھی ہے، اور یہ بات دکنی ادب مین عام ہے،

۳- یائے معروف و مجہول مین کوئی فرق نہین ہے،

[1] لیکن اس کا سال کتابت معلوم نہین ہے،

۴- ہائے ہوز کی مختلف شکلون کو بغیر کسی امتیاز کے لکھا ہے،

۵- الف ساکن کے پہلے زبر ہے، اور ایسے الف پر اکثر مد لکھا گیا ہے،

۶- ہمزۂ مکسورہ کے نیچے دو نقطے ضرور ہین،

۷- حرف نفی "نہ" کو اکثر پہلے یا بعد کے لفظ سے جوڑ کر لکھا ہے،

پھر حضرت شمس العشاق میران جی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۹۰۲ھ) کے کلام کا ایک مجموعہ جو تصوف کے متعلق ہے، کراچی مین ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کے یہان ملتا ہے، یہ غالباً ۸۵۰ھ مین مرتب ہوا تھا، اس مین حضرت میران جیؒ کے کچھ اشعار بھی ہین، ایک جگہ "تبیل الانسان" کے ذیل مین جو اشعار ہین ان مین سے دو یہ ہین،

ایہن جانیا جیون آپنان جیون وہی رہی   اسکون دیکھت آپ گنوایا گیان کلا بھی رہی

تن تین نبنب سمایا جبیا پرکاسین پرکاس   کیر ہو کہ بنیا آپ نبادی پر جو سہج اُداس

یہ مجموعہ بھی نسخ مین ہے، اور اس کی خصوصیات یہ ہین،

۱- ک پر ایک ہی مرکز ہے، اور اکثر اس کے نیچے تین نقطے ہین،

۲- یائے معروف و مجہول مین کوئی امتیاز نہین ہے، اور یہ بات تو بہت بعد تک رہی ہے،

۳- "لا" کی مختلف شکلین اکثر دو چشمی ھ سے بنائی گئی ہین، یہ چیز بھی بہت بعد تک پائی جاتی ہے،

اسی قسم کی املائی خصوصیات حضرت شیخ بہاء الدین باجن (المتوفی ۹۱۲ھ) کے دوہرون مین بھی پائی جاتی ہین[1]، بلکہ حضرت شاہ علی جیونی (المتوفی ۹۷۳ھ) کے دیوان جواہر اسرار اللہ" مین بھی یہی چیزین ہین، مثلاً اس مین ایک جگہ ہے:-

"نکتہ پنجم در تخلص"

[1] مولانا رشید برہان پوری کا کتب خانہ،

کی لوک کو نہ دکہ دھین جانون جو ایسا کو سہین

منجہ باج علیجیو کی کھین اے بھائیو ھون سون کرون[۱]"

یہ نسخہ بھی نسخ مین ہے،

حافظ محمود شیرانی مرحوم نے اورینٹل کالج میگزین (بابت اگست ۱۹۳۰ء) مین آٹھوین اور نوین صدی ہجری کے اردو فقرے اور دوہرے نقل کئے ہین، پھر اسی میگزین (نومبر ۱۹۳۰ء) مین حضرت شیخ باجنؒ کے مختلف اشعار بھی نقل کئے ہین، جن مین کئی چیزین اہم ہین، حضرت باجنؒ کے یہان جمع مضارع کی ایک خاص شکل ہے، یعنی دھرنہ (دھرین کے بجائے) کرنہ (کرین) بلنہ (بلین) ترنہ (ترین) مانگنہ (مانگین) وغیرہ جو پنجابی جمع کے مطابق ہے، اسی طرح پنجابی طرز کی جمع کانٹیان (کانٹے) انکھیان (انکھین) کے ساتھ ساتھ برج کی جمع کلالنہ (کلالون) درویشنہ (درویشون)، راتنہ (راتون) اورنہ (اورون) وغیرہ بھی ہین فعل مستقبل مین کریسون (کرون گا) دلیسون (دون گا) اتریسی (اُترے گا) بھی ہے، اور ہمارے موضوع املا کے لحاظ سے ان کے یہان حسب ذیل چیزین پائی جاتی ہین،

۱- جمع اور جمع مضارع، نیز مصادر ایک کا پر ختم ہوتے ہین، تم اُنَ، جنَ، نیتَ، باتون، لینَ، دینَ، وغیرہ بھی کا پر ختم ہوتے ہین (۲) حروف مشدد کو دوبار لکھا ہے (۳) ٹ، ڈ، ڑ کے لئے کوئی امتیازی علامت نہین ہے، اور وہ ت، د، ر، کی طرح ہین،

حضرت باجنؒ کے بعد دسوین صدی کے ختم ہوتے ہی یعنی سنہ ۱۰۰۲ھ مین مصطفےٰ تخلص کے ایک دکنی (گجراتی) شاعر نے نور نامہ لکھا تھا، یہ نسخ مین اکسٹھ صفحات کا ایک رسالہ ہے، جس مین تقریباً سوا چار سو اشعار ہون گے، آخر مین جو اشعار ہین، اُن سے شاعر اور اُس کی تصنیف وغیرہ کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہین،

[۱] مولوی عبدالحق صاحب کا ذاتی کتبخانہ کراچی،

فارسی تھا سو دکھنی بات کہا مصطفےٰ حُبِ سنکات

کوئی پیر دیکھین کے درحال میرے حُب کا یو ہی خیال

یان تی مزا نین مجکون جان نور نامہ کا کیا بیان

جکوی پیر دیکھی ہوے شاد مجھ عاجز کون کری یاد

شیخ قطب عالم کی ین اولاد نور نامہ کا ین کیا بنیاد

نور محمد کا نور محمد مین مین بیٹھا لکھیا اوسان مین

یکہزار دو اگلی سان جان نور تھا قدرت کا یون نشان

ہور بھجو نبیؐ پہ ہم صلوٰۃ بھی یکلیمی ستتی میری بات

نبی صلوا علی وآلِ رسول مجھ خادم کہیں کون کرنا قبول

ھی مجکون آپس بھی یو نفا تجھ ناؤن کاری ہوں[۱] مصطفےٰ

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا نام مصطفےٰ ہے جو اپنے کو حضرت قطب العالم برہان الدین ابو محمد عبداللہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۸۵۷ھ) بٹوہ۔ احمد آباد کی اولاد مین کہتا ہے، اور یہ کہ اُس نے سنہ ۱۰۰۲ھ مین یہ نور نامہ فارسی سے دکھنی مین منتقل کیا، اُس کی شاعری کے متعلق تو کچھ کہنے کی ضرورت نہین ہے لیکن اس نسخے کی املائی خصوصیات ضرور ہمارے موضوع کے لئے اہم ہین، وہ یہ ہین:-

۱- کاف اور گاف دونون پر ایک مرکز ہے، جو اس زمانہ مین عام تھا، (۲) ٹ، ڑ کے لئے نیچے تین نقطے ہین، (۳) "ٹ" "ڑ" کی جگہ چار نقطے ہین، (۴) "ہ" کو اکثر دوچشمی ھ سے لکھا ہے، اور یاے معروف و مجہول وغیرہ کا امتیاز نہین ہے، ان کے علاوہ لسانی خصوصیات وہی ہین، جو دکھنی اردو مین پائی جاتی ہین، وزن اور قافیہ وغیرہ کی بھی کوئی خاص پروا نہین ہے، کیونکہ اس قسم کے عقیدت مند لوگ اول تو شاعر ہی نہ تھے

[۱] یہ نسخہ بھی مولوی عبدالحق صاحب کے یہان ہے، راقم الحروف نے معارف (جنوری سنہ ۱۹۴۰ء) مین ولی ویلوری کی تین

اور جو شاعری کرتے بھی تھے، انکو اس پر فخر و ناز نہ تھا،

اس کے بعد ملا وجہی کا نمبر آتا ہے، جس کی مثنوی قطب مشتری اور نثر سب رس کو مولوی عبد الحق صاحب شائع کر چکے ہین، اور ان کتابون کی لسانی اور املائی خصوصیات پر بھی اظہار رائے کر چکے ہین، اس لئے اس کے بجائے اس کے معاصر ابن نشاطی کا ذکر کیا جاتا ہے، جس نے مثنوی پھول بن ۱۰۶۶ھ مین لکھی تھی [1]، یہ بھی نسخ مین ہے، اس مین سبب تالیف اس طرح بیان کیا گیا ہے :-

مجھے یک دن دیا ہاتف نے آواز | پرتکی داستان کی اے سخن ساز
سخن کا آج تون کر گوہران سنج | سخن کا کھولتا ہین کیا سبب گنج
جگت کون کی سناتا ہین یو باتان | شکر پر کی تون لکھتا ہین براتان
تیری گفتار سون عالم ہے شکر | دمی تیری شعر کا ہر لکھ کون شکر
سخن کی پھول کی تاثیر تی تون | معطر کر جگت یک دھیر تے تون
خوشی سون آخوشکی ہاتھ پر آج | تون کانا نکون جگت کی عید کر آج

اس کی املائی خصوصیات یہ ہین :-

۱- ٹ کے لئے چار نقطے اوپر ہین، (۲) ڑ کے لئے اکثر تین نقطے نیچے ہین، مثلاً :-

ھلتا ھی نہ جلتا ہی موا تھا | تمام اپنی سون کام اس کا ہوا تھا
(روح و جسم آبو)

اس طرح ڈ کے لئے تین نقطے نیچے ہین،

(بقیہ حاشیہ ص ۴۰۹) مثنویون کے ساتھ ۱۱۰۰ھ کی مثنوی پند نامہ اور ۱۱۰۲ھ کی "اساس المقتی" کا ذکر بھی کیا تھا، [1] ایضاً ابن نشاطی کی پھول بن کے جواب مین ہنر نے نیہ درپن ۱۱۲۳ھ لکھی تھی، (اردوے قدیم، از حکیم شمس اللہ قادری ص ۱۰۰) سید محمد والہ (المتوفی ۱۱۸۳ھ) نے بھی اس کے جواب مین مثنوی "منی و طالب" لکھی تھی، والہ لکھتا ہے :-

ندیکھے کوئی تیرون آہستہ پگ پگ | چلون اوس کا ندگی اوس کا ندکون لگ

لیکن کہین کہین ڑ اور ڈ کے تین نقطے اوپر بھی ہین،

(۳) کہیں کہیں گاف پر دو مرکز نظر آتے ہین، یہ کتابت اس لحاظ سے قدیم نمونہ سمجھی جائے گی

(۴) واو معروف کے لئے اکثر ایک سیدھا پیش دیا گیا ہے، یہ چیز خاص ہے،

(۵) الف پر اگر مد کی ضرورت ہے، تو اکثر مقامات پر دو الف لکھے گئے ہین،

(۶) ہائے ہوز کو ہر جگہ دوچشمی ھ لکھا گیا ہے،

(۷) عام دستور کے مطابق یائے معروف و مجہول مین کوئی امتیاز نہین ہے،

(۸) اوس (اُس) اون (اُن) واو کے ساتھ لکھے گئے ہین،

حضرت شیخ برہان الدین غریب رحمۃ اللہ علیہ کے مرید شیخ رکن الدین ابن عماد الدین کاشانی نے تصوف پر ایک کتاب فارسی مین شمائل الاتقیاء و دلائل الاتقیاء کے نام سے لکھی تھی، اس کا دکنی ترجمہ میران یعقوب نے ۱۰۸۲ھ مین کیا تھا، وہ بھی نسخ مین ہے اور اس طرح شروع ہوتا ہے،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حمد و ثنا اتقیا و اصفیا کی کنان، ھور خصمتان کی زمین، بیحد و بی پایان ھور سرا، بجانا اولیا و انبیا کی نیکیان، ھور منتان کے، بجانت بی کنت، ھور بی انت، اس یک پاک ذات کون، واجب ہور سزاوار ہے، کہ جنی پرہیز گاران کے، تئی کرن اپنی نزدیکی کے پائے دیا کہ

(بقیہ حاشیہ ص ۴۱۰) سنیا ہون مین قصہ اک ہور دزن کا | بندھا ابن نشاطی پھول بن کا
دلے دو دو نکو نین لگتا ہے چندان | نہ تھا طبع کا پھول اس سخن خندان

والہ کی مثنوی میر کی دریائے عشق اور مصحفی کی بحر المحبت سے ملتی جلتی ہے،

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ یعنی تحقیق خدا کی نزدیک بہت بزرگ تم مین او کوی ہے، جو تم تمنا

مین بہت پرہیزگار ھی[۱]،

اس نسخے مین بھی ٹ، ڈ، گاف، کا وغیرہ کے لئے وہی علامات ہین، جو اس سے پہلے والے نسخے

مین ہین، لیکن اس میں ایک خاص بات یہ ہے کہ فقرہ یا کلمہ وغیرہ ختم ہونے پر ہر جگہ ایک بڑا گول (سُرخ)

نقطہ دیا گیا ہے، گویا اُس زمانہ سے ہماری زبان مین علاماتِ وقف نظر آتے ہین،

۱۰۹۶ھ کی لکھی ہوئی ایک بیاض ملتی ہے، جس مین مختلف شعرا کے دوہے ہین، اس کے آخر مین یہ

عبارت ہے :-

"بتاریخ ۲۰ رجب المرجب ۲۸ جلوس والا بندۂ درگاہ گلاب رائے سوائی بیاد گار

بقلعہ سولاپور وقتے کہ در تہیۂ روانہ شدن بُرہان پور بود نوشت"

خطِ ما بہر یادگار ما ست — صاحبِ حال بے قراری ما ست"

ایک جگہ مالکِ بیاض کے دستخط اس طرح ہین، "عاجز صاحب لال لالہ گردھاری لال جیو" پھر

یہ شعر فارسی مین ہے :-

دوائے صندل و عنبر نہ سازگارِ من ست

علاجِ دردِ سرم خاکِ پائے یارِ من ست

اس بیاض مین اہتمام خان، احمد، افضل، فاضل، نول رام، موہن لال وغیرہ کے دوہے

ملتے ہین، اہتمام خان غالباً عالمگیری امیر تھا، اس کا ایک دوہا یہ ہے :-

نینن بھی سورج گھی دھری جات پی ادر — ان نینن کون مور کھا کیتی راکھون ہور

---

[۱] یہ نسخہ بھی مولوی عبد الحق صاحب کے یہان ہے، لیکن اس کے آخر مین ایک جگہ سنہ ۱۱۰۵ھ لکھا ہوا ہے، اس کے بعد جن مخطوطات کا ذکر اس مضمون مین آئے گا، وہ اکثر مولانا راشد صاحب برہان پوری کی ملک مین ہیں،

احمد کا دوہا سنئے :-

کاگوں گھبرا رو یئے کاکون کیجے سوگ — احمد سنگ سرائے کو کبھی بتا دیوگ

افضل کا دوہا اس طرح ہے،

گورے مکھ پر سیام تل اینچ لیو جی جور — افضل گھر مین کیا رہے پرت چاندنی چور

فاضل نے یون کہا ہے،

جے بھانور پی تم وے تے ہم وے نِدان — بھانور کے بھانور کے بھانور دھو فاضل دیران

نول رام کا دوہا بھی سنئے،

پاتی دیکھ ہاتھ کی او دھو چیر نن لاگ — نول رام درسن بنا نینن لاگے آگ

ایک دوہا موہن لال کا بھی سنئے جو غالباً مالکِ بیاض "صاحب لال" کا عزیز ہوگا، دوہا یہ ہے،

کو جانے کا سون کھون کو پوچھے یہ بات — موہن موہن لال کے سدھ آئے سدھ جات

اس بیاض کی خصوصیات یہ ہین :-

۱- گاف کے لئے ایک خاص علامت ہے، یعنی ایک مرکز بنا کر اس پر چھوٹا سا ہندسہ، کا بنا دیا گیا ہے، یہ اسی طرح ہے جس طرح ہم نشان دہی کے لئے ایسا، کچھ کھینچ کر بنا دیتے ہین،

۲- جی، پی وغیرہ دو حرفی اسما رجب یائے مدہ پر ختم ہوتے ہین تو اُن کے آخر مین بجائے واو کے ہائے مختفی ہے،

۳- مخلوطی، اور غیر مخلوطی کا ہین کوئی فرق نہین ہے،

۴- یائے معروف کو عموماً گول ہی سے لکھا ہے، اور درمیان مین ایسی ی آئی ہے، تو اُس کے نیچے چھوٹا الف لکھا ہے، جیسے "اینچ"

۱۰۹۶ھ کی لکھی ہوئی جو بیاض دوہون کے متعلق ملتی ہے مذہبی سے منسلک چند اوراق ریختہ سے

متعلق ہین اور خط سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہ اوراق بھی اسی کاتب کے لکھے ہوئے ہین،

آپنے یہ مصرع تو بہت سُنا ہوگا ع:- بیکار مباش کچھ کیا کر

یہ دراصل ایک قطعے کا مصرع ہے، جو اس بیاض مین موجود ہے، قطعہ اس طرح ہے :-

بے کار مباش کچھ کیا کر　　　خونِ دلِ عاشقان پیا کر

از رشتۂ زلفِ خویش ہردم　　　چاکِ دلِ عاشقان سیا کر

اس بیاض مین ایک خاص غزل ریختے کی ہے، جو امیر خسرو کی معلوم ہوتی ہے[1]، حافظ محمود شیرانی مرحوم نے پنجاب مین اردو" (پہلا اڈیشن ص ۱۲۷) مین امیر خسرو سے منسوب ایک غزل نقل کی ہے، اُس کا پہلا شعر یہ ہے:

جب یار دیکھا نین بھر دل کی گئی چنتا اتر　　　ایسا نہین کوئی عجب راکھے اسے سمجھائے کر

اس کا مقطع یہ ہے،

خسرو کہے باتان غضب دل مین نہ لاوے کچھ عجب

قدرت خدا کی ہے عجب جب جیو دیا گل لائے کر

قاضی فضل حق صاحب نے اورنیٹل کالج میگزین (مئی ۱۹۳۲ء ص ۹۵) مین امیر خسرو کی جو غزل نقل کی ہے اس کا مقطع بھی اسی طرح ہے،

خسرو کہے باتان عجب دلبر نہ پاوے اک قدر

قدرت خدا کی یہ عجب مین جی دیا پر لائے کر

لیکن ہماری بیاض مین جو اشعار ہین، وہ ردیف کے علاوہ قافیون کے لحاظ سے بھی اسی غزل سے متعلق معلوم ہوتے ہین، و دان مین اس غزل کا مطلع بھی ہے،

---

[1] خسرو کا ایک دوہا سب رس ص ۱۰۱ مین ملتا ہے،

پنکھا ہو کر میں ڈلی ساتی تیرا چاؤ　　　مجھ جلتے جنم گیا تیرے لیکھن باؤ

تا کے خورم خونِ جگر کا سون کہون دکھ جائے کے　　　شورے فتادہ در تنم پی دے گئے سر کائے کے

ہر چند گفتم این سخن اے دل بکس رغبت مکن　　　ان کی یہ رہے ات کٹھن بھوتا ہی سمجھائے کے

از دردِ تو بے جان شدم طاقت نماندہ در تنم　　　کے پیت دے آوان کرو کے وہ لیو مولائے کے
(استغاثت)

اس کی خصوصیات بھی وہی ہین، جو دوسرون کی بیاض میں ہین یعنی :-

۱- گاف کے لئے ایک مرکز اور اس پر، کا ہندسہ

۲- ایک ہ کا اضافہ، جیسے کچھ کو "کرچھ" لکھا ہے، "پی جی" وغیرہ مین ہائے مختفی بھی ہے،

۳- مخلوطی اور غیر مخلوطی ہ مین کوئی فرق نہین ہے، اور ی کے استعمال مین کسی طرح کا کوئی امتیاز نہین ہے،

۱۱۴۲ھ مین نقل کیا ہوا سولہ ورق کا ایک رسالہ ہے، جس کا نام مصنف محمد نے پریم کہانی لکھا ہے:-

کے محمد پریم کہانی　　　سُن لو سنتا بھیو گیانی

آخر مین یہ عبارت ہے :-

"تمت تمام شد بتاریخ ہفتم شہر جمادی الاول ۱۱۴۲ھ در شاہ جہان آباد در حویلی لالہ حکومت رائے با تمام رسید"

اس مین ۷۰ شعر کے بند ہین اور تلسی داس کی راماین کی طرح ہر بند کے بعد ایک دوہا ضرور ہے، ایک بند اس طرح ہے،

پایا یون ہدی کرُ میٹھا،　　　ملا پنتھ جو درسن دیٹھا

نا نون پیارا شیخ برہانون　　　کلمی نگر کہنہ استھانون

او تھنہ درس کو سایک پاوا　　　الہ داد کر پنتھ لکھاوا

الہ داد جگ سدھ نویلا　　　سید محمد کے سُکھ چیلا

جگ جگ امر حضرت خواجے　　　حضرت نبی رسول نواجے

دانیال تو پر گھٹ کینھان   حضرت خواج خضر پنتھ دینان

اس بند سے معلوم ہوا کہ اس رسالے کا مصنف محمد مہدوی عقائد سے تعلق رکھتا ہے، اُس نے مہدوی فرقے کے بانی سید محمد جونپوری (المتوفی ۹۱۰ھ/۱۵۰۵ء) کے سلسلہ کا ذکر کیا ہے، کہ حضرت خواجہ خضر نے حضرت دانیال چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی رہبری فرمائی تھی، یہ بزرگ وہی ہین، جن کے نام پر اکبر نے اپنے ایک بیٹے کا نام ۹۸۱ھ مین دانیال رکھا تھا، شاعر نے حضرت دانیال چشتی کے مرید سید محمد جون پوری اور اُن کے "عشرہ مبشرہ" مین سے ملک الہداد کا ذکر کیا ہے، اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ملک موصوف کے مُرید شیخ بُرہان تھے، حالانکہ مہدوی کتابون مین اُن کو بھی سید محمد کے "عشرہ مبشرہ" مین شمار کیا جاتا ہے[۱]، اس مخطوطے کی خصوصیات یہ ہین،

۱۔ مخلوطی "ھ" کو عموماً دوچشمی لکھا ہے،

۲۔ "ٹ" پر چھوٹا "ط" لکھا گیا ہے، کہین کہین ایسے "ط" کے نیچے دو نقطے بھی ہین،:۔

۳۔ "گاف" پر ایک ہی مرکز ہے، اور کبھی کبھی دوسرا مرکز پیش دے کر ظاہر کیا گیا ہے، یہ خاص چیز ہے،

۴۔ حروفِ مدہ کے پہلے اگر ن ہو، تو اُن کے بعد نونِ غنہ لگا دیا گیا ہے، جیسے بُرہانون (برہانو) استھانون (استھانو) کینھان (کینھا) دینان (دینا) وغیرہ،

غالباً گیارھوین صدی ہجری کا لکھا ہوا ایک مخطوطہ وفات نامہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہے، نہایت پاکیزہ نسخ خط مین ہے، اور مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کی املا کی کئی خصوصیات کا حامل ہے، اُس کے کچھ اشعار یہ ہین:۔

موت مُجھ کون میر یَہ تھاری جانون   دنیا خواب کی باری جا نُون
اُس مُی دو دروازی ہو وِہی   ایک تھی پیٹ تماشا جو دِہی
دو جی تھین جب نکلے بھار   تماشا اُس کا جائے بِسار

[۱] راقم کے پاس مہدوی مذہب کے بانی سید محمد جونپوری کی شہادت کے متعلق ایک مثنوی دکھنی زبان مین شرف الدین کی موجود ہے، اس مین ملک الہداد وغیرہ کا حال بھی ملتا ہے،

دنیا کون بھی یو نہین پچھانون   تعبیر اُس کی دل ماں آنون
تم کون کام نہ آوتی کوری   خوبی دل سون دیکھو جوئی
نکی اوپر امید دھرو،   بدی کرنی تھے بھوت ڈور

اُس کی املائی خصوصیات یہ ہین،

۱۔ ٹ کے لئے چھوٹے "ط" کی جگہ چار نقطے ہین، اور ڈ کے لئے ڈ پر ایک زبر ہے،

۲۔ جزم کو عموماً گول دائرے کی طرح لکھا ہے، لیکن جب ماقبل حرف مفتوح ہے، یا مجہول تو الٹا جزم مثل ہلال کے ہے،

۳۔ سوائے ایک آدھ جگہ کے اکثر مقامات پر مخلوطی ھ کو دوچشمی لکھا ہے،

۴۔ یائے معروف کے لئے مکسور حرف کے نیچے چھوٹا الف ہے،

لسانی خصوصیات مین سے کے لئے تھین اور تھے ملتا ہے، امر مین اور خصوصاً اُس وقت جب کہ واؤ کے پہلے ن ہے، تو ایسے واؤ کے بعد نون غنہ آتا ہے، اسی طرح پہچانو کے بجائے پچانون ہے، لازم مصدر "آنا" کو متعدی بنا کر "امر آنون" بنایا ہے، جیسے اس مصرع مین ہے، ع

تعبیر اس کی دل مان آنون

اسی مصرع مین "دل مین" کی جگہ "دل مان" ہے، جو برج سے متعلق ہے، اور مثنوی بھی برج بھاشا کے ایک وزن مین ہو کہ فعلن، فعلن، فعلن، فعلن۔ ہندی وزن بھی ہے،

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور وفات نامہ ملتا ہے[۱]، جو ۱۱۰۰ھ مین مرتب ہوا تھا، مخلوطے کے آخر

[۱] امین گجراتی نے ۱۱۰۸ھ مین مثنوی یوسف زلیخا لکھی تھی، اُس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ولادت نامہ بھی لکھا تھا، اسکے چند اشعار یہ ہین:۔

اس ذکر کے صدقے چلا جاوے امین اندر بہشت   عاصی کر بخشنا پیدا ہے تون بخشین تجھے سب ہو سکت
مطلب رہے تھے درمیان اس کا بیان تون سون مین   آخر پایا تھے ایک گرہ اب وہ گرہ کھولون سون مین

مین یہ شعر ہین:-

ہوا نسخہ یہ ہجرت بعد سارا | ہوئے تھے برس اک گیارہ سو گیارہ
دیا تون فیض کون توفیق یارب | کیا اس کے سبب امر مرتب[1]

یعنی فیض شاعر نے ۱۱۱۱ھ مین اسے مرتب کیا، مخطوطہ نسخے مین ہے، شروع کے کچھ اشعار یہ ہین:-

بنا اول کرون حمد خدا مین | زبان اوپر ایس کی ابتدا مین
کیا قدرت سے ظاہر اپنی قدرت | بنا کر جگ دکھیا آپ اپنی حکمت
نہ تھا سو سب کیا ہر شے کو موجود | کہوایا سب کسی کا آپ معبود
دیا ہر شے کون اپنی آشنائی | پچھانت کی دلان مین دی صفائی
کیا نین وصف کوئی اس کا نہایت | کوئی جانا تو اتنا ہی زیادت
مجھے توفیق دے یارب تو دودون | زبان ہجر نبیؐ دکھنی مین کھودون
کہون صلوات کہ کو بعد ازان مین | نبیؐ جو نقل کہتے سون بیان مین

اس نسخے کی خصوصیات یہ ہین:-

۱- اس مین عموماً مخلوطی کا کو دو چشمی لکھا گیا ہے، بہت کم مقامات پر اس اصول سے اختلاف ہے،

۲- یائے معروف اور یائے مجہول مین اکثر و بیشتر آج کل کے مطابق امتیاز ہے، لیکن

۳- کاف اور گاف مین کوئی امتیاز نہین ہے،

ولی گجراتی (المتوفی ۱۱۵۵ھ) اور میر و سودا کے عہد کی زبان مین جو اجزا مشترک تھے، ان کے متعلق ڈاکٹر عبدالستار صدیقی فرماتے ہین:-

"بوجھنا (پہچاننا) بولنا (کہنا) پون (ہوا) پی، پیو، سجن، موہن، پیونا (پینا) تجھ، مجھ،

[1] یہ شعر صحیح نہین پڑھا گیا، اس لئے صحیح طور پر نہین کہا جا سکتا، کہ فیض تخلص ہی بھی یا نہین،

(تیرا، میرا) جیو (جی) الگ (تلک)، نین، نین (آنکھ، آنکھین) ستی، سیتی (سے) کنے (پاس) نپٹ پنٹھ (بالکل، سراسر) یہ اور اس طرح کے بہت سے لفظ دکنی شاعرون کے کلام کے علاوہ، دلی، پنجاب، صوبۂ متحدہ اور بہار مین اب تک بولے جاتے ہین کسی لفظ مین حرف علت کا گھٹ کر ایک حرکت رہ جانا یا حرکت کا کھنچ کر حرف علت ہو جانا، جیسے اپر (اوپر)، دکھو (دیکھو) لاگا (لگا) لوہو (لہو)، اودھر، ایدھر، جیدھر تشدید کا جاتا رہنا یا کسی حرف پر تشدید کا آجانا جیسے اتنا سے اتا، اور پھرایا، اور پات سے پتا ہو جانا یہ سب صورتین دلی کے شاعرون کے کلام مین بھی موجود ہین، نون غنہ پرانے زمانہ مین بہت تھا، یہان تک کہ بعضے لوگ فارسی لفظون کو جیسے پیچ، پانچہ کو کونچہ، پینچ، پانچہ لکھا کرتے تھے،..... ملفوظ کا خاص کر دلی اور پچھان کے اور مقامات مین اکثر جاتی رہتی ہے، اور اس کی جگہ اکثر ایک مخلوطی یا ہمزہ لے لیتا ہے، جیسے بہت کی جگہ بوت، کہتا کے لئے کیتا، کہون (کہون) اسی طرح کئین، یا کہن، اور دئن، اور زمین عام طور پر سنا جاتا ہے..... ملفوظ کہین حذف ہو جاتی ہے، جیسے گھبراہٹ سے گھبراٹ، اور کہین مخلوط ہو جاتی ہے، جیسے وہان سے وحان، یہان سے یحان کہین مخلوطہ اپنی جگہ بدل لیتی ہے، جیسے گرھنا (گھڑنا)، بعضے لفظون مین ان دونون کا قلب اور ابدال ایک ساتھ ہوا ہے، جیسے پہچان اور پچھان، پہونچا، اور پونچھا، لفظ کے بیچ یا آخر مین سے مخلوطہ اکثر جاتی رہتی ہے، "بھوک (بھوکھ) تڑپ (تڑپھ)، دھوکا (دھوکھا)، سامنا (سامھنا)، مانجنا (مانجھنا) بھکاری (بھکھاری) اب سے تھوڑے دن پہلے تک دونون طرح سے لکھے جاتے رہے ہین"[1]

تقریباً بارھوین صدی ہجری مین گلستانِ سعدی کا دکھنی زبان مین ترجمہ ہوا، بندۂ ہمان بہ کہ..... الخ

اور اس کے بعد کی عبارت کا ترجمہ اس طرح ہے:-

[1] رسالۂ اردو، جولائی ۱۹۴۵ء ص ۲۹۴،

"بندہ وہ بہتر ہے کہ تقصیر سے اپنے عذر بیچہ درگاہ خدا کے لاوی اور نے لائق ہے، صاحبی کون اس کے کوئی نے سکتا کہ بجالاوی، رحمت بے حساب اس کا سبب تنین آکے پہنچایا، اور خوان طرح طرح کے نعمتون بید ریغ اوس کا سب جگا کہیں چا، اور پردہ شرم بندون کا ساتھ گناہ کے نی پہاڑتا اور وظیفہ روزی کمانیوالون کا ساتھ، گناہ بد کے نے لیجاتا،"

اس مخطوطہ میں املاسے متعلق وہ تمام خامیاں ہیں، جواب دور ہو چکی ہیں، مثلاً یاے معروف و مجہول کا کوئی امتیاز نہیں ہے، ک اور گ میں کوئی فرق نہیں ہے، ہیش کے ئے ترکی کی تقلید مین واو کا استعمال ہے، جیسے "اوس" اور "پہنچایا"، مخلوطی اور غیر مخلوطی ہ کا فرق بھی نہیں ہے، مرکب الفاظ کہین جڑے ہوئے ہین اور کہین بے جڑے ہین کہین کہین ... لفظ کے بھی ٹکڑے کر ڈالے ہین، جیسے "کہین جا" البتہ ڑ کے لیے چار نقطے ہین، "اور نہین" کو صرف "نے" (فارسی کی طرح) لکھا ہے،[۵۱]

اسی طرح کا ایک مخطوطہ لوائح جامی کی شرح میں ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ شمالی ہند میں لکھا گیا ہے، اس میں سے جستہ جستہ مقامات اس طرح ہین،

"لائحہ نمبر ۳۔ مکاشفہ بوجھو تم کو بیچ اس لائحہ کے تاکید کرتے ہین واسطے واسطے مراقبۂ دائمی کی اور مراد نسبت سے مراقبہ ہے کہ بیچ گندنے لائحہ کے مراقبہ فرمائے ہین، واقف نفس باید بود یعنی واقف اپنے دم کے چاہئے ہونا کہ ہوش در دم اس کو کہتے ہین، رُخ گرچہ نمی نمائیم سال بسال رُخ دکھانے سے رویتہ اور شہود ہے، سال بسال سے مراد ہے، ہمیشہ و شہود دائمی ہے، یعنی عاشق کہتا ہے کہ ہون اگرچہ نہین دکھاتا ہے، تو مجھے ہمیشہ بیچ اس دنیا کے شہود دائمی محال ہے اسی واسطے یومنون بالغیب تعریف ہے بیچ حق مومنون کے"

ایک جگہ ہے کہ

---

[۵۱] عبداللہ فتحی گجراتی کا قیامت نامہ "جو ۱۱۱۱ھ میں لکھا گیا اسی قسم کی املائی خصوصیات پر مشتمل ہے، اس میں ڈال کی ڈال پر چار نقطے بھی ہین،

فقیر تھوڑا ایک رمز بولا ہے، باقی اللہ سمجھا یگا اپنے طالبون کو۔"

اس مخطوطے میں صرف ایک خصوصیت مزید یہ ہے، کہ ڑ کے لئے بجائے چار نقطون کے صرف تین نقطے ہین، رحمت اللہ گجراتی جو غالباً بارھوین صدی ہجری سے تعلق رکھتا ہے، قصیدۂ غوثیہ کا منظوم ترجمہ کیا ہے، آخری شعر یہ ہیں،

قصیدۂ غوثیہ پونچا تمامی　　　　مریدان تم کرو اُن کی غلامی
بیان ہی رحمت اللہ بی نہایت　　　　کرو تم سامعان کی اب رعایت

مخطوطے کے آخر مین یہ عبارت ہے:۔

"رقمیہ میان اسمٰعیل ساکن دھوراجی۔"

یہ مخطوطہ پاکیزہ نسخ مین ہے، اور ابتدائی اشعار یہ ہین:۔

قدح مجھ وصل کا حقنی پلایا　　　　مین تب شوق الٰہی کون بولایا
اسی مستی نے مجھ مین جوش کیتا　　　　تبی یاران ہنین بازی مین جیتا

املائی خصوصیات یہ ہین:۔

۱۔ مخلوطی حروف سوائے "مجھ" کے اکثر بغیر ہ کے ہین، جیسے تبھی کی جگہ تبی ہے، اسی طرح "پہنچا" کو "پونچا" لکھا ہے،

۲۔ یاے معروف و مجہول مین کوئی فرق نہیں ہے، البتہ جس یاے ساکن کے قبل زبر ہے اس "ی" کو نصف دائرہ دیا ہے،

بالکل انہی خصوصیات کا حامل ایک اور مخطوطہ بھی ملتا ہے، جو ارکان اسلام کے متعلق ایک سو اشعار پر مشتمل ہو اور اسی شاعر کی تصنیف ہے، آخری اشعار مین شاعر کا نام آتا ہے،

خدایا بخش سب مسلمان کون　　　　کہ دنیا سین لیجین بہ ایمان سون

کہ رحمت اللہ ای رب الرحیم مجھے دین پر رکھ صراط مستقیم

عہدِ عالمگیری کے مشہور فارسی دان میر عبد الواسع ہانسوی نے غرائب اللغات کے نام سے ایک فرہنگ لکھی تھی، جس مین ایسے ہندی الفاظ دیئے گئے تھے، جن کے معنی آسانی سے فارسی لغات مین نہین ملتے، ۱۱۶۵ھ مین سراج الدین علی خان آرزو نے اُس فرہنگ کی تصحیح کی، اور زیادہ تر ایسے الفاظ پیش کئے ہین جو گوالیری یعنی برج سے تعلق رکھتے ہین، اس زبان کو وہ جگہ جگہ "افصح السنۂ ہندی" کہتے ہین، عبد الواسع نے عہد عالمگیر کی دہلوی زبان کے جو الفاظ پیش کئے وہ بھی ہمارے موضوع کے لئے مفید ہین، انھون نے ڈکوڈ ہی لکھا ہے، مثلاً ساڈھو (ساڑھو) گڈھی (گڑھی) جھاڈ (جھاڑ) مسوڈھا (مسوڑھا) اسی طرح چلبن کو چلون، پانا کو پاونا، چڑانا کو چڑوانا، پچھلانا کو پچھلاونا، لکھا ہے[۵۰]،

خان آرزو غالباً پہلے شخص ہین، جنھون نے دخیل الفاظ کے تلفظ اور املا کے متعلق یہ رائے دی ہے کہ وہی صورت اختیار کی جائے جو اہلِ زبان مین رواج پذیر ہو چکی ہو، اور ایسے لفظون کے لئے اصلی زبان کی پیروی ضروری نہین ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہین کہ نہ صرف آرزو کی نوادر الالفاظ مین بلکہ عبد الواسع[۵۱] کی غرائب اللغات مین صوبت کو سوبت، صابن کو سابن، چاقو کو چاکو، نقشہ کو نقشا، غلولہ کو غلولا لکھا گیا ہے[۵۲]،

مذکورہ بالا چیزون کے علاوہ اس عہد مین زبر، زیر، پیش کے لئے حروفِ علت کا رواج ہے، لیکن

---

[۵۰] اورینٹل کالج میگزین، نومبر ۱۹۳۱ء ص ۱۵، یہان یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ غالباً آرزو نے سب سے پہلے یعنی ۱۱۶۵ھ مین صرف "اردو" کا لفظ زبان کے لئے استعمال کیا ہے، اس کتاب مین کئی جگہ آیا ہے، مثلاً

"مکتوہ در عرف اردو بمعنی حرفِ ماندہ فرد دست و بمعنی سه رخ بمعنی تکمیر"

[۵۱] رسالہ اردو (جنوری ۱۹۵۱ء) ص ۳۱) میرزا خان نے بھی تحفۃ الہند مین الفاظ کا تلفظ وہی دیا ہے، جو روز مرہ مین مستعمل تھا، ملاحظہ ہو، رسالہ ہندستانی جنوری ۱۹۳۵ء ص ۱۶-۲۲ - [۵۲] خطوط غالب (مہیش پرشاد خط نمبر ۴۷) مین بھی چاکو کو چاک کا اسم فاعل کہا گیا ہے،

مخلوطی کا رواج نہین ہے، اسی طرح یاے معروف اور مجہول مین فرق نہین ہے، لیکن ڈ کے لئے طا کی علامت عربی ہ کی طرح ہے، کہین کہین چار نقطے بھی ہین،

خان آرزو نے ایک اور بات پر بھی زور دیا ہے، یعنی ہندی الفاظ کے آخر مین ہائے مختفی لکھی جائے، یا نہین، اس سلسلہ مین گذارش ہے کہ عالمگیر کے عہد مین فضائل خان کے عرض کرنے پر کہ ہندی رسم الخط مین اسم و کلمہ کے آخر مین ہا نہین آیا کرتی، بلکہ الف ہوتا ہے... اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایسے الفاظ کو الف کے ساتھ لکھا جائے، عالمگیر نے یہ تجویز پسند کی اور حکم دیا کہ آیندہ ایسے کلمے الف کے ساتھ لکھے جائین یعنی مالوہ کو مالوا بنگالہ کو بنگالا..... اس فرمان کی تعمیل نہ صرف شاہی دفاتر اور ٹکسالون مین ہوئی بلکہ اردو خوان لوگون نے بھی یہی املا اختیار کر لیا[۵۱]، "خان آرزو نے اس عالمگیری فرمان پر محاکمہ کیا ہے، لکھتے ہین :-

"بدان کہ این قسم لفظ کہ آخر آن ہائے مختفی بود، فارسیان آن را بہائے مختفی تلفظ کنند و ہندیان بالف مثلاً بنگالا و مالوا و روپیا کہ زر رائج ہندوستان است آنہا بنگالہ و مالوہ و روپیہ گویند و نویسند، چنانچہ از کلام اساتذہ و محاورۂ اہل زبان بثبوت رسید، پس در ہندی این قسم الفاظ را بہائے مختفی خواندن غلط باشد و در فارسی بہ الف، و آنچہ در عہدِ عالمگیری این قاعدہ برہم خوردہ بود و در دفاتر بنگالہ و مالوا وغیرہما بہ الف می نوشتند محض غلط، و منشاء آن غفلت از تحقیق است[۵۲]"

بات صرف یہ ہے کہ بعض شعرا نے ایسے الفاظ کا قافیہ ہائے مختفی والے الفاظ کے ساتھ باندھا ہے، اس لئے خان آرزو نے یہ حکم لگایا ہے، ورنہ یہ حقیقت ہے کہ وہ ہندی الفاظ جو الف پر ختم ہوتے ہین، محض عربی اور فارسی کی تقلید مین ہائے مختفی سے لکھے گئے تھے.

---

[۵۱] پنجاب مین اردو - (مقدمہ) - ماثر الامراء (جلد ۳ - ص ۳۹)

[۵۲] رسالہ اردو - جنوری ۱۹۵۱ء ص ۳۰،

تاریخ بخشی جو ۱۱۱۸ھ میں لکھی گئی اس میں املا کی خصوصیات یہ ہیں :-

۱۔ ٹ کے لئے چار نقطے اوپر دیئے گئے ہیں، مثلاً :- باٹ، ٹھور،

۲۔ ڈ، ڑ کے لئے پ اور چ کی طرح تین نقطے نیچے دیئے گئے ہیں، جیسے ڈال، جھاڑ، لڑکا،

۳۔ ہندی کے "ڑ" کے لئے "ڑ" لکھا گیا ہے، جیسے کھانا کو کھانڑا، دانہ کو دانڑا،

۴۔ یائے معروف و مجہول، ہائے ہوز اور دوچشمی، کاف اور گاف میں کوئی فرق نہیں ہے،

۵۔ عربی اور فارسی الفاظ جو ہ پر ختم ہوتے ہیں، الف سے لکھے گئے ہیں، مثلاً :-

تھا، حصا، خزانا، پیشا، اندیشا، ہمیشا وغیرہ[٥٠]

اسی زمانہ میں یعنی بارھویں صدی ہجری، اور اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں طباعت کا سلسلہ ہندوستان میں شروع ہوا، علامہ عبداللہ یوسف علی نے کلکتہ گزٹ کا پہلا نمبر مورخہ ۴ مارچ ۱۷۸۴ء دکھا تھا جس میں خلاصۂ اخبار، دربار معلی بہ دار الخلافت شاہ جہان آباد" کے عنوان سے ایک کالم فارسی ٹائپ میں چھپا ہوا تھا، یہ دراصل مغل شاہنشاہ کے دربار میں "واقعہ نویس" کا روزنامچہ تھا جس کے روزمرہ کے واقعات فارسی کے مقابل کالم میں انگریزی ترجمے کے ساتھ شائع ہوتے تھے، پھر یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد شروع ہوا یعنی منشی سدا سکھ کی ادارت میں ۲۸ مارچ ۱۸۲۲ء میں سماچار درپن کا فارسی ایڈیشن "جام جہان نما" کے نام سے شائع ہوا جس میں آدھا حصہ فارسی میں اور آدھا اردو میں ہوتا تھا، یہ پہلا اردو اخبار تھا، پھر ۷ مئی ۱۸۲۳ء کو ماتھر موہن متر کی ادارت میں "شمس الاخبار" شائع ہوا، وہ بھی آدھا فارسی میں اور آدھا اردو میں ہوتا تھا[٥١]، تاہم اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں نستعلیق ٹائپ کا جو نمونہ دستیاب ہوتا ہے[٥٢] اس میں املائی خصوصیات یہ ہیں،

---

٥٠ اورنٹیل کالج میگزین (نومبر ۱۹۳۳ء ص ۱۱) ٥١ بحوالہ اردو رسم الخط محمد سجاد مرزا، ص ۱۳)
٥٢ نوائے ادب بمبئی بابت اپریل ۱۹۵۵ء ٥٣ اردو رسم الخط صفحہ ۱۶ کے مقابل والا عکس،

۱۔ یائے ساکن کے پہلے اگر زبر آتا ہے تو اُسے نصف دائرہ دیا گیا ہے، جیسے ہے، تھی،

۲۔ یائے معروف و مجہول میں گول اور لمبی یے والا فرق ہے،

۳۔ مخلوطی ھ جو ہندی کی ہے، اُسے دوچشمی ھ سے لکھا گیا ہے،

۴۔ ٹ وغیرہ کے لئے موجودہ ٹائپ کی طرح دو نقطے اور اُن کے اوپر ایک ڈیش (چھوٹا خط) لگا دیا گیا ہے[٥٣]

یہی اصول بعد میں فورٹ ولیم کالج والوں کی کتابوں میں رائج ہوئے، تاہم اٹھارہویں صدی عیسوی کے ختم ہوتے ہی یعنی ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۲ء میں انشا نے دریائے لطافت لکھی، اور اس کتاب میں املا کے لئے یہ اصول بھی پیش کئے ہیں :-

کبھی امر حاضر مفرد پر ہمزہ اور یائے مجہول زیادہ کرکے جمع بناتے ہیں، جیسے اٹھیے،

کبھی ہمزہ سے پہلے جیم مکسور (فعل متعدی میں) بڑھاتے ہیں، جیسے کیجئے، لیجئے، دیجئے،

..... لیکن یہاں (جیم وغیرہ کے بعد ہمزہ کا حذف ..... جائز بلکہ زیادہ فصیح ہے"[٥٤]

اس بات پر انشا نے زور دیا ہے کہ کیجئے، لیجئے، وغیرہ پر ہمزہ نہیں لکھنا چاہئے، اور حقیقت بھی یہی کہ ہمزہ اور ے کا تلفظ "ائے" ہوتا ہے، یے نہیں ہوتا، جو مطلوب ہے لیکن اس اصول پر نہ صرف انشا نے زور دیا ہے بلکہ ہم نے دکن کے متعدد مخطوطات میں ایسی جگہ ہمزہ نہیں دیکھا[٥٥]، ہمارے پاس ایک مثنوی "جنگ بدر" کے متعلق ہے، اُس میں ایسے مقامات پر کہیں ہمزہ نہیں ہے، مثلاً :-

لگا پوچھنے کون ہے کیون اضطراب	دیے اوس کوں عباس نے یوں جواب
دیئے اس کون انکار سینی جواب	کہا پھر وہ ملعون نے کریوں خطاب

۲۔ پھر انشا فرماتے ہیں کہ

---

٥٤ دریائے لطافت (انجمن ترقی اردو) ص ۲۰۰-۲۰۱) ٥٥ لیکن شمالی ہند کے مخطوطات میں یہ بات موجود ہے مثلاً ہمارے پاس نوطرز مرصع کا قلمی نسخہ جو ۱۲۵۲ھ کا لکھا ہوا ہے نہ صرف اس طرح کے ہمزہ کے ساتھ ہے بلکہ دوسری املائی خامیوں کا بھی حامل ہے،

"ادھر، کیدھر، اودھر (اوس وغیرہ) کو...... کتابت میں ضمے کی رعایت سے واؤ اور کسرے کی رعایت سے ی لکھ دیتے ہیں اور بعضے نہیں لکھتے، صحیح وہ ہیں، جو نہیں لکھتے، کیونکہ اگر ترکی کے قاعدے کے مطابق حرف مضموم کے بعد واو اور حرف مکسور کے بعد ی لکھنا ضروری ہے تو حرف مفتوح کے بعد الف بھی لکھنا چاہیے، (لیکن) ایسا نہیں ہوتا، جہاں چہ رہا، کہا، چلا، کو (ترکی کی تقلید میں) رہا، کاہا، چالا، نہیں لکھتے، (تو پھر بلا وجہ) اردو میں ترکی کی ٹانگ توڑنے کے کیا معنی؟ (اسی طرح) لفظ اس (اشارۂ قریب) میں یا نہیں لکھتے، لفظ اُس میں واؤ لکھتے ہیں، اِس بیچارے نے کیا قصور کیا ہے، کہ بغیر یا کے لکھتے ہیں[48]......... اس گفتگو سے ثابت ہوتا ہے کہ لفظ اُس اور ایسے تمام اردو لفظوں میں جن میں ضمہ بغیر واؤ کے آواز دیتا ہے، واؤ کا لکھنا صحیح نہیں، ایسا ہی حال ی کا ہے، جس حرف کے بعد تلفظ میں اس کا اظہار ہو تو کتابت بھی درست ہے،* ورنہ غلط[49]"

۳- انشار کا یہ تیسرا اصول یہ ہے کہ جن ضمائر کے بعد ہی مستعمل ہوتا ہے، وہاں ہی کو مستقل جزو کے بجائے ادغام کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ "انھیں سے" اصل میں "اُن ہی سے" ہے، لیکن اب نقل کا استعمال اصل سے بہتر سمجھا جاتا ہے،[50]

۴- چوتھی چیز انشار کے نزدیک یہ ہے، کہ جس لفظ کے آخر میں الف (یا ہ) ہو اور اس کے بعد حرف جارہ، فاعلیت مفعولیت، اور اضافت کی حالت میں آئیں تو وہ الف (یا ہ) یے سے بدل جائے گا، ا م

* بعض قدیم مخطوطات میں "ہے" کی جگہ "ایسے" دیکھا گیا ہے، رنگین کی قلمی مثنوی ایجاد رنگین (مملوکہ مولانا رحمن علی مرحوم ریاست ریوان) میں بھی ہے،

طول اے رنگیں ایسے اب دیجئے کیا   الغرض اپنا بھی ہے کچھ مدعا

۴۹ دریائے لطافت ص ۲۲۶، ۲۲۹، ۵۰ ایضاً ص ۳۰۶،

یہ تبدیلی دراصل متغیرات میں داخل نہیں[51]"

اس کی مثال یوں سمجھیے کہ ہم "ایک لڑکا نے" کے بجائے "ایک لڑکے نے" تو لکھتے ہیں لیکن اس "تماشے میں" کے بجائے اس معاملہ میں "تماشا میں" لکھنے پر اصرار کرتے ہیں،

۵- پانچویں چیز انشار کے یہاں (مفرد اور جمع کے بیان میں) یہ ہے کہ اردو الفاظ کے آخر میں ہ کے بجائے الف ہی ہونا چاہیے، مثلاً بیڑا، کیلا، اندرسا، کھیرا، چیتا، پپیہا، وغیرہ کو وہ الف سے لکھتے ہیں[52]

یہ وہی چیز ہے جس کے متعلق ہم اوپر پڑھ چکے ہیں کہ عالمگیر نے فضائل خان کی تجویز پر حکم جاری کیا تھا، پھر اُسی پر خان آرزو کا محاکمہ بھی ہم دیکھ چکے ہیں،

انشار کے بعد غالب نے املا کے اصولوں پر زور دیا ہے چنانچہ وہ بار بار اپنے شاگردوں اور عقیدت مندوں کو آگاہ کرتے ہیں، مثلاً منشی بہاری لال مشتاق کو لکھتے ہیں:-

"یہ تقلید اور انشار پردازوں کے، تمھاری عبارت میں بھی املا کی غلطیاں ہوتی ہیں، میں تم کو جابجا آگاہ کرتا ہوں، خدا چاہے، تو املار کی غلطی کا ملکہ بالکل زائل ہو جائے[53]"

قدر بلگرامی کو بھی لکھتے ہیں کہ

"صاحب تم نے مثنوی خوب لکھی ہے، کہیں املا میں کہیں انشار میں جو اغلاط تھے، وہ رفع کیے اور ہر اصلاح کی حقیقت اُس کے تحت میں لکھ دی[54]"

غالب کے بعض اصول یہ تھے:-

۱- نہ "ذ" کو عربی حرف سمجھتے تھے، اس لئے فارسی اور ہندی لفظوں میں ث، ح، ص، ض، ط، ظ، ع بھی استعمال نہیں کرتے تھے، لیکن "ذ" کو غالب نے معلوم نہیں کس وجہ سے فارسی لفظوں سے خارج کیا

۵۱ دریائے لطافت ص ۳۰۷، ۵۲ ایضاً ص ۳۳۶، ۵۳ اردوئے معلی - مبارک علی - ص ۳۳۸، ۵۴ ایضاً ص ۱۰۱،

جب کہ وہ تذرو آذر (آتش) اور کاغذ میں لکھا جاتا ہے، اس حرف کے متعلق صحیح تحقیق ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی ہے، وہ فرماتے ہیں،

"گذشتن، گذاشتن، پذیرفتن، یہ سب ذال سے ہیں، البتہ گزاردن زے سے صحیح ہے"

میرزا غالب نے پہلے نادانی سے پھر سخن پروری اور سینہ زوری سے ذال کو فارسی سے خارج کرنے کی کوشش کی، اردو میں یہ لفظ زے سے لکھئے، تو مضائقہ نہیں، مگر فارسی میں ذال لکھنا ضروری ہے" [۵۱]

اس سلسلے میں یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ اردو والوں نے خواہ مخواہ بھی ذال کو لکھنا چاہا ہے، مثلاً بجز زخار کو بہت سے لوگ ذال سے لکھتے ہیں، حالانکہ زے سے صحیح ہے "درامنڈتا ہوا چڑھا ہوا" کے معنی میں آتا ہے، بعض لوگ زکریا کو بھی ذال سے لکھ دینے میں تامل نہیں کرتے، ذات بمعنی قوم و نژاد، دراصل سنسکرت जात से बना है، اُسے بھی ذات (شخصیت) یعنی ذال سے لکھتے ہیں، یہی حال آذوقہ کا ہے، جسے غلطی سے ذال سے لکھ دیا جاتا ہے، ذرہ بمعنی "تھوڑا اور کم" سے ہم نے ایک لفظ "ذرا" بنا لیا، جو معنی، تلفظ، اور استعمال میں مختلف ہو گیا، اس لئے زے سے لکھنا بہتر ہے، حالانکہ غالب سے پہلے رنگین تو اس نئے معنی میں بھی ذرہ "لکھتے تھے، مثلاً ع

ذرہ اس تاگے کو تو دینا ہلا [۵۲]

۲- اورنگ زیب اور انشاء کی طرح غالب کا اصول یہ تھا، اور یہ صحیح تھا کہ جن لفظوں کی اصل فارسی یا عربی نہیں ہے، ان میں مختفی ہ نہیں آسکتی ہے"

---

۵۱ دیباچۂ مکاتیب غالب (عرشی - ص ۲۲۳) فارسی میں ذال اور دیکھئے:-

گر نویسم ترا یکے تعویذ | پاک دارائے جوان مار پلید | (حدیقۂ سنائی طبع لکھنؤ ص ۱۷)

۵۲ رنگین نے ذرا بھی دوسرے معنی میں استعمال کیا ہے:-

حرص کے دانتوں کو اب مت تیز کر | بحثِ بد سے ذرا پرہیز کر | (حکایت یہودی ایجاد رنگین)

مولانا احسن مارہروی نے رسالۂ فصیح الملک ۱۹۰۵ء میں "ذرا" کی تائید کی ہے ۵۳ رسالہ ہندوستانی جولائی ۱۹۳۸ء

۳- تیسری چیز غالب نے یہ قائم کی کہ فارسی کے لفظ بھی جب اردو محاورے میں آئیں، تو ان کو الف سے لکھنا چاہئے، جیسے اور "مزا یہ کہ ...... لیکن مزہ طعام وغیرہ موقعوں پر وہ بے شک مختفی ہ لکھتے تھے" [۵۴]

۴- چوتھی چیز جس پر غالب بہت زور دیتے تھے، وہ یائے تحتانی کے متعلق ہے، مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں:

"صاحب دیکھو پھر تم ڈگمگا کرتے ہو ...... غلطی میں جمہور کی پیروی کیا فرض ہے؟ یاد رکھو یائے تحتانی تین طرح پر ہے، (۱) جزو کلمہ، ع ہمائے بر سر مرغان ازان شرف دارد، اور:- اے سرنامہ نام تو عقل گرہ کشائے را، یہ ساری غزل اور مثل اس کے جہاں یائے تحتانی ہے، جزو کلمہ ہے، اس پر ہمزہ لکھنا عقل کو گالی دینا ہے، (۲) دوسری یائے تحتانی، مضاف ہے، صرف اضافت کا کسرہ ہے، ہمزہ وہاں بھی مخل ہے، جیسے آسیائے چرخ، یا آشنائے قدیم، توصیفی، اضافی، بیانی، کسی طرح کا کسرہ ہو، ہمزہ نہیں چاہتا، فدائے تو شوم، رہنمائے تو شوم، یہ بھی اسی قبیل سے ہے (۳) تیسری دو طرح پر ہے، یائے مصدری اور وہ معروف ہو گی، دوسری طرح توحید و تنکیر، وہ مجہول ہو گی، مصدری (کی مثال) آشنائی، یہاں ہمزہ ضرور، بلکہ نہ لکھنا عقل کا قصور، توحیدی (کی مثال) آشنائے یعنی ایک آشنا، یا کوئی آشنا، یہاں جب تک ہمزہ نہ لکھو گے دانا نہ کہاؤ گے، ..... خستہ، بستہ، غازہ، خانہ ... وغیرہ ہزار لفظ ہیں، کہ اُن کے آگے جب یائے توحید آتی ہے، تو اس کی علامت کے واسطے ہمزہ لکھ دیتے ہیں (اسی طرح) زرہ گرہ، کلاہ شاہ ...... ایسے الفاظ کے آگے اگر تحتانی آتی ہے، تو زرہی گرہی، کلاہی، شاہی .... لکھ دیتے ہیں" [۵۵]

اسی کے ساتھ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے، کہ جو لفظ مختفی ہ پر ختم ہوتے ہیں، اضافت

---

۵۴ رسالۂ ہندوستانی، جولائی ۱۹۳۸ء اسی طرح عربی لفظ بھی جب اپنی حقیقت بدل دیں تو انھیں بھی اردو کے مطابق لکھیں چنانچہ طیار کو تیار لکھنے کی تاکید کی ہے (خط بنام قدر بلگرامی) ۵۵ اردوے معلیٰ ص ۲۷۳، ۲۷۴،

کی حالت میں اُن کے آخر میں ہمزہ لکھتے ہیں، یعنی ہمزہ یا تو کسرۂ اضافت کا قائم مقام ہے، یا پھر یائے وحدت کا

جیسے ع

آہ افسوس کنان مغبچۂ بادہ فروش

ہمزہ ماضی قریب واحد حاضر میں بھی ی کے بجائے ہوتا ہے لیکن عطف کے واؤ سے پہلے اضافت کا ہمزہ

نہیں آتا، البتہ وحدت یا حاضر (مخاطب) کا ہمزہ آتا ہے، جیسے ع

عجب واقعہ و غریب حادثہ ایست

اور جیسے کوئی کہے "خوش آمدۂ و صفا آوردۂ"[۵۱]

ان کے علاوہ شبہہ اور جبہہ کو دو ھ کے ساتھ لکھتے تھے، (خطوطِ غالب، ہمیش پرشاد نمبر ۹) اور

یہی صحیح بھی ہے، خط نمبر ۱۳۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خرشید بغیر واؤ کے لکھتے تھے، البتہ صرف "خور" کو (غالباً

التباس کے خوف سے) واؤ کے ساتھ لکھتے تھے، جنون بریلوی کے خط میں پانو، گانو، چھانو وغیرہ میں نونِ

غنہ پہلے اور واؤ بعد میں لکھا ہے لیکن "گھنیٹنا" کے بجائے "گھسیٹنا" صحیح کہا ہے "ہاتھ" کو وہ "ہات" لکھتے تھے، اُن

ہاتھی کو "ہاتی"[۵۲] لیکن خط نمبر ۲۶ (خطوطِ غالب) سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ "تڑپھنا" کو بجائے تڑپنا صحیح سمجھتے تھے، خط

نمبر ۴۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چاقو کو "چاک کردن" سے مشتق مان کر چاکو لکھتے تھے، حال آن کہ چاقو ترکی لفظ ہے،

ان پابندیوں کے باوجود غالب کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ (۱) معروف و مجہول یے اور

واو میں کوئی فرق نہیں رکھتے تھے (۲) ہائے مخلوطی کے لئے دوچشمی ھ کی پابندی نہیں تھی (۳) ترکی کی تقلید میں

پیش کی حرکت واؤ سے ظاہر کرتے تھے، (۴) لکھیے سمجھیے وغیرہ پر پہلے ہمزہ لکھتے تھے، لیکن بعد میں ہمزہ سے ایسی

چڑ پیدا ہوئی، کہ جہاں اس کی ضرورت تھی، وہاں سے بھی علحدہ کر دیا، مثلاً آجائے، لائے، لگ جائے گی،

آئے ہو، ہوئے وغیرہ افعال پر سے ہمزہ قلمزد کر دیا،[۵۳]

---

۵۱ رسالہ ہندستانی، جولائی ۱۹۳۳ء ص ۲۴۴ ۵۲ رسالہ اردو جنوری ص ۳۲۸ کے سامنے والا عکس غالب نے "بھوکا"

ان بزرگوں کے بعد اور اب سے ۴۶ سال پہلے یعنی مئی ۱۹۰۵ء کے رسالہ فصیح الملک میں مولانا احسن

مارہروی مرحوم نے املا پر بہت زور دیا، اور اُس زمانہ تک جو اصول قائم ہو چکے تھے، اُن پر سختی پابندی کے

ساتھ عمل شروع کیا، انھوں نے خصوصاً ان باتوں پر زور دیا:-

۱- ہی کو جب ضمیر کا آخری جزو بنایا جائے تو "وہی" اور "یہی" کے بجائے "وہی" اور "یہی" لکھا جائے لیکن مولانا

احسن نے تمھیں، انھیں اور ہمیں میں اشباعی الف نیچے لکھ کر تمہین انھین اور ہمین (بجائے تھی، تمھی کے) لکھنا پسند

کیا ہے، اسی طرح وہ "یوں ہی" کے بجائے "یونہیں" نثر و نظم دونوں میں لکھتے تھے،[۵۴]

۲- دیکھیے دیجئے، اس لئے وغیرہ میں ے کے پہلے ہمزہ نہ لکھا جائے،

۳- ہندی الاصل الفاظ کے آخر میں ہائے مختفی نہ ہو، بلکہ الف ہو، جیسے پتا، بھروسا، سامنا، دھوکا، کلیجا،

ٹھینا، ٹھیکا وغیرہ، اسی طرح حلوا، معما، تمغا، چلیپا، ناشتا، وغیرہ میں خواہ مخواہ ہ نہ لکھی جائے،

۴- جس لفظ کے آخر میں ہ آئے، تو فاعلیت، مفعولیت اور اضافت کی حالت میں اسے یے سے لکھا جائے،

جیسے کسی زمانے میں "اسی طرح حالتِ ترکیب یعنی اضافت و عطف میں بھی عربی فارسی الفاظ اسی طرح لکھے

جائیں، جس طرح بولے جاتے ہیں، مثلاً "لب و لہجے میں" "مقدمے بازی میں" وغیرہ،

۵- مولانا احسن اسی رسالہ میں لکھتے ہیں کہ:-

"یائے معروف و مجہول کا لحاظ تو عام طور پر کیا جاتا ہے، مگر یائے ماقبل مفتوح کی کتابت کوئی

خاص نہیں، اُس کے لئے نصف دائرہ مناسب ہے، جیسے ے شے وغیرہ"

(بقیہ حاشیہ ص ۴۳۰) اور "دونوں" لکھا ہے، دیباچۂ مکاتیب غالب ص ۲۲۹ ۵۳ دیباچہ مکاتیب غالب ص ۲۲،

غالب کی املا کی مزید خامیاں اسی دیباچہ میں دیکھی جا سکتی ہیں،

۵۴ غالباً صرف جلال لکھنوی نے "یوں ہی" کے بجائے "یونہیں" لکھا ہے، ع

جلایا گئے وہ شبِ وصل میں   یونہیں رات بھر شمع محفل رہا

۶۔ نون کے متعلق لکھتے ہین، کہ

"نون کا تلفظ اردو مین دو طرح ہے، جو نون آخر لفظ مین ظاہر کر کے پڑھا جائے، وہ نقطہ دار ہوگا، جیسے جان، تان، اور جو اس طرح ظاہر نہ ہو اُس مین نقطہ نہ ہوگا، جیسے یہاں، کہاں، درمیان لفظ مین اگر نون بالاظہار ہو، تو اُس پر معمولاً صرف نقطہ ہوگا، جیسے تنکا، اور اگر اعلان نہ ہو تو اس پر نقطے کے بجائے یہ نشان (الٹا جزم) ہوگا، جیسے تانبا"

اسی طرح ہائے مخلوط کے متعلق لکھتے ہین کہ وہ

"ہمارے نزدیک صرف وہی ہے، جو تجون مین اپنے اول و آخر حروف سے ملے جیسے بھی، بھان، اس کی کتابت دو چشمی ھ سے ہوگی، باقی ہر لفظ مین ایک ایک شوشے لکھی جائے گی، جیسے کہین، جگہ، ہو وغیرہ"

۷۔ اسی رسالہ مین مولانا لکھتے ہین کہ

"جو الفاظ الگ لکھے جانے مین اجنبی نہین معلوم ہوتے، اور جن کی ترکیب بھی جداگانہ ہے، اکثر جدا جدا لکھے جائین گے، جیسے آئین گے ہون گے جس کی، آپس مین، غرض کہ، بل کہ، کیون کہ علاحدہ حال آن کہ، چنانچہ، چونکہ، کون سی، اس واسطے کہ دل چسپ، دل کش، ہم سر کم یاب دست یاب، خوب صورت) وغیرہ"

ان کے علاوہ مولانا احسن مرحوم نے رسالہ فصیح الملک (اگست ۱۹۰۵ء) اور تاریخ نثر اردو (صفحہ ۳۵۶-۳۵۹) مین بہت سے الفاظ کی صحت پر زور دیا ہے، وہ دائم المریض نہین، بلکہ دائم المرض، روح روان نہین بلکہ روح و روان لکھتے تھے، اہل دہلی کی طرح ایجاد کو مذکر اور طرز کو مونث لکھتے تھے، ازدہام کو ازدحام، فی زمانہ کو فی زماننا، سیکڑون کو سیکڑون، جھونٹ کو جھوٹ، سونچ کو سوچ، پرواہ کو پروا، ازدہے کو اژدر، غش غش اور عبیر دونون کو الف سے اور خود دونون کو آخر نونِ غنہ سے لکھتے تھے، عربی تے پر صرف

تنوین لکھنے پر زور دیتے تھے، مثلاً فطرۃً، قدرۃً، ضرورۃً، دفعۃً، مقابلۃً، نسبتۃً وغیرہ، لیکن قیم کے ساتھ یسیر (بمعنی قلیل) اور وجیہ کے ساتھ شکیل (مترادف) کو غلط سمجھتے تھے، غالب کی طرح وہ بھی گزشتن گزر وغیرہ کو زے سے لکھتے تھے، لوٹنا کی جگہ پلٹنا، ناراضگی کی بہ نسبت ناراضی اور جاکے، کھاکے، وغیرہ کی جگہ جاکر کھاکر کو فصیح سمجھتے تھے،

انکے بعد فن املا کے امام ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے بار بار اس کی اصلاح اور ترمیم پر زور دیا ہے، رسالہ اردو (اکتوبر ۱۹۲۳ء) رسالہ ہندستانی (جنوری ۱۹۳۱ء جولائی ۱۹۳۰ء) وغیرہ مین وقتاً فوقتاً اپنے علیحدہ مضامین لکھے ہین، پھر یہی اصول اخبار ہماری زبان (یکم اگست ۱۹۴۱ء) اور رسالہ اردو (جنوری ۱۹۴۲ء) مین شائع ہوئے ہین جو انجمن ترقی اردو نے اختیار کئے ہین،

خلاصہ | شروع مین خط نسخ کا رواج زیادہ تھا، اسی لئے پشتو، سندھی، اور پنجابی آج بھی نسخ مین لکھی جاتی ہین، ۸۲۵ھ کی تصنیف کی ہوئی مثنوی کدم راو، پدم راو (جس کا سال کتابت معلوم نہین) نسخ مین ہے،

۸۔ گیارھوین صدی ہجری کے اکثر مخطوطات نسخ مین ملتے ہین، پھر ۱۱۱۱ھ کا لکھا ہوا وفات نامہ (آنحضرت اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) بھی پاکیزہ نسخ مین ہے، اس کے بعد رحمت اللہ گجراتی کے رسالے بھی نسخ مین ملتے ہین، اہم غالباً اسی صدی کے آخر کا ایک مخطوطہ فال وجودی بھی نسخ مین ہے، وہ اس طرح شروع ہوتا ہے :-

"اول چاھیے کہ بوجھے کہ انسان کی جسم مین شمس و قمر کس کون کھتی ھیں، بوجنا کہ جمنی (داہنے) سوراخ کون شمس کھتی ھیں اور ڈابی (بائین) سوراخ کون قمر کھتی ھین جب حرارت غالب ھووی تب شمس کون بند کری، روئی سین اور سردی غالب ھووی، تب قمر کون بند کری اور کبی ھمیشہ دن کون شمس بند کرے، اور

(ات کون قمر"

لیکن شمالی ہند اور دکن مین یہ مخطوطات دسوین اور گیارہوین صدی ہجری سے ضرور نستعلیق مین پائے جاتے ہین[۱]،

گ کے لئے نوین صدی ہجری مین کاف عربی کے نیچے تین نقطے لکھے جاتے تھے، ۱۰۹۶ھ کی لکھی ہوئی ایک بیاض مین گ کے لئے ایک مرکز ہے، اور اس پر ، کا ہندسہ ہے، ۱۱۰۱ھ کی لکھی ہوئی بیاض مین گ پر ایک مرکز ہے، اور کبھی کبھی ایک پیش بھی ہے، اسی بیاض مین ٹ پر چھوٹا ط بھی ملتا ہے، اور کہین کہین اُس کے نیچے دو نقطے بھی ہین،

دسوین صدی ہجری کے ایک مخطوطے مین مشدّد حرف کو دوبار لکھا گیا ہے، اسی طرح الف ممدودہ کو دو الف کی شکل مین لکھا جاتا تھا، اور الف مدہ کے لئے زبر اور مد دونوں ہوتے تھے،

گیارہوین صدی ہجری مین ٹ کے لئے ط کے علاوہ چار نقطے بھی ایک بیاض مین ملتے ہین، اور ڈ کے لئے دال پر ایک زبر، اسی بیاض مین مخلوطی ھ اکثر نظر آتی ہے، اور جزم کو عموماً گول دائرے کی طرح لکھا ہے، لیکن جہان ماقبل حرف مفتوح یا مجہول ہو تو وہان الٹا جزم مثل ہلال کے ہے، اسی مخطوطے مین یائے معروف کے لئے حرف مکسور کے نیچے چھوٹا الف ملتا ہے، شیرانی مرحوم نے لکھا ہے کہ

ٹ، ڈ، ڑ پر پہلے تین تین نقاط، بعد مین چار چار نقاط لگائے جانے لگے، اور گجرات مین بارہوین صدی ہجری کی ابتدا مین ان پر ضرب کی علامت × لگائی جاتی تھی"[۲]

تین نقطون والے ڑ کی مثال ہم کو بارہوین صدی ہجری کے ایک مخطوطے بھی ملی ہے، جو لوائح جامی کی شرح ہے، اور اسی صدی کے ترجمہ گلستان مین ڑ پر چار نقطے ملتے ہین، اسی صدی کے ایک مخطوطے

---

[۱] پروفیسر شیرانی مرحوم نے لکھا ہے (مقدمہ پنجاب مین اردو) کہ عالمگیر کے بعد شمالی ہند مین نستعلیق رائج ہوا، سنہ ۱۱۵۸ھ مین تاریخ عزیزی لکھی گئی، اس مین ٹ کے اوپر چار نقطے ہین لیکن ڈ، ڑ کے نیچے تین نقطے ہین، [۲] شیرانی مرحوم نے لکھا ہے کہ بعد مین گ و ف کے لئے تین نقطے اوپر لگائے جانے لگے، (انتخاب مین اردو مقدمہ) [۳] ایضاً مقدمہ

مین ڈ کے لئے دال پر دو نقطے اور اس پر ڈ ٹیش ہے، یہی چیز ہم کو اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر کے نستعلیق ٹائپ مین ملتی ہے،

اسی صدی مین رحمت اللہ گجراتی کے نسخون مین کہین کہین یائے ساکن کے قبل اگر زبر ہے، تو اس یا کو نصف دائرہ دیا گیا ہے، پھر اورنگزیب کے فرمان کے بموجب وہ ہندی الفاظ جو فارسی کی تقلید مین مختفی ہ پر ختم کئے جاتے تھے، الف سے لکھے جانے لگے، اور اٹھارہوین صدی عیسوی کے آخر مین جب نستعلیق ٹائپ رائج ہوا، تو بہت کچھ ترقی یافتہ املا کا رواج ہونے لگا، ان کے بعد انشاء اور غالب وغیرہ نے جو اصلاحین اور تجویزین اس فن سے متعلق پیش کی تھین وہ سب اوپر آچکی ہیں، اب ہمارے اساتذہ کا فرض ہے، کہ زبان کی یکرنگی کو قائم رکھنے کے لئے اپنے اسلاف کی کوششون پر نظر رکھتے ہوئے، آسان اور بہتر اصول اختیار کرین تاکہ مبتدی بھی کوئی وقت محسوس نہ کرے،

فلسفۃ البلاغت

از

مولانا عبد السلام ندوی

شاعری اور انشا پردازی کے حسن و قبح کا تمام تر دار و مدار ذوق سلیم پر ہے، لیکن موجودہ دور کے بعض ادیبون[1] نے مادی اصول اور مادی نظریات کو ان کا معیار قرار دیا ہے، اور فصاحت و بلاغت کے نظریات و اصول کو انھی مادی اصول اور مادی نظریات پر منطبق کیا ہے، مثلاً اس زمانہ کی تمام ترقیون کا دار و مدار مشینون پر ہے، اور مشینون کے ذریعہ سے جو کام انجام پاتے ہین، ان سب مین کم سے کم قوت اور کم سے کم وقت صرف ہوتا ہے، بعینہ یہی اصول شاعری، انشا پردازی اور فصاحت و بلاغت پر بھی منطبق ہوتا ہے، یعنی جن الفاظ، جن اشعار اور جن انشا پردازانہ فقرون کے سمجھنے مین سننے والے کی کم سے کم دماغی قوت اور اُس کا کم سے کم وقت صرف ہوتا ہے، وہ زیادہ فصیح و بلیغ ہوتے ہین، اور جن الفاظ، جن انشا پردازانہ فقرون کے سمجھنے مین اس کو زیادہ دماغی قوت اور زیادہ وقت صرف کرنا پڑتا ہے، وہ فصاحت و بلاغت کے معیار سے گر جاتے ہین،

اس لئے فصاحت و بلاغت کا عام اصول بھی وہی ہے، جو مادی مشینون کا ہے، یعنی جس مشین کے ذریعہ سے کام کے انجام دینے مین کم سے کم وقت اور کم سے کم قوت صرف ہوتی ہے وہ بہتر سمجھی جاتی ہے، بعینہ اسی طرح جن الفاظ، جن اشعار اور جن انشا پردازانہ فقرون کے سمجھنے مین سننے والے کو کم سے کم دماغی قوت اور کم سے کم

[1] شام کے ایک عیسائی کالج کے عربی پروفیسر جبر ضومط نے فلسفۃ البلاغت کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے، یہ مضمون اسی سے ماخوذ ہے،

وقت صرف کرنا پڑتا ہے، وہ زیادہ فصیح و بلیغ ہوتے ہین،

مثلاً ایک سادہ مفہوم کے ادا کرنے کے تین طریقے ہین،

۱- ایک تو یہ کہ اوس مفہوم کو الفاظ کے ذریعہ سے ادا کیا جائے،

۲- دوسرا یہ کہ آواز کے ذریعہ سے ادا کیا جائے،

۳- تیسرا یہ کہ اشارات کے ذریعہ سے ادا کیا جائے،

لیکن یہ تیسرا ذریعہ زیادہ عام فہم ہوتا ہے، مثلاً اگر ایک شخص کو بلانا ہو، اور اوس کو یہ کہکر بلایا جائے کہ "یہان آؤ" اس کے بخلاف اگر اوس کو صرف اشارہ سے بلایا جائے، تو یہ دوسرا طریقہ اس کے لئے زیادہ عام فہم ہوگا،

اسی طرح جو الفاظ سادہ معانی مثلاً تعجب، افسوس، مدح و ذم، امید و آرزو، فریاد، ڈرانے اور بھڑکانے کیلئے وضع کئے گئے ہین، مثلاً عربی زبان کے یہ الفاظ "یا للماء" "یا للحفرۃ" "یا اللہ" "واہاً" "ویک" "یا لیت" "یا حبذا" جن سے تعجب، فریاد، مدح، افسوس، اور آرزو کا اظہار کیا جاتا ہے، ان معانی کو زیادہ واضح اور موثر طریقہ پر ادا کرتے ہین، اس کے بخلاف اگر ایک پورے جملے مین اُن کا ترجمہ کر دیا جائے، تو اُن کی فصاحت و بلاغت اور اثر کا خاتمہ ہو جائے گا، جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان الفاظ کے سننے مین سننے والے کو کم سے کم دماغی قوت صرف کرنی پڑتی ہے، کیونکہ یہ الفاظ مختلف اجزاء سے مرکب نہین ہین، جن کے سمجھنے اور پھر ان اجزاء کو ان معانی پر جو اُس کے دماغ مین ہین منطبق کرنے مین اپنی دماغی قوت کو صرف کرنا پڑے، یہی اصول ہے جو فصاحت و بلاغت کے تمام اصول و قواعد پر منطبق ہوتا ہے، اور ہم اوس کو سب سے پہلے مفرد الفاظ پر منطبق کرتے ہین،

فصیح الفاظ کا انتخاب

جب کوئی لفظ بولا جاتا ہے، تو پہلے انسان کی دماغی قوت اس لفظ کے تلفظ پر صرف ہوتی ہے، اس کے بعد وہ اپنی دماغی قوت اس لفظ کے معنی کے سمجھنے پر صرف کرتا ہے، اس لئے لفظ جس قدر آسان ہوگا، اور اس کے حروف جس قدر کم ہون گے، اسی قدر اُس کے بولنے اور سمجھنے مین انسان

کی دماغی قوت کم صرف ہوگی، خود زبان کی بنیاد بھی اسی اصول پر قائم ہے، کیونکہ سہ حرفی الفاظ چار حرفی الفاظ سے زیادہ ہیں، اور پنج حرفی الفاظ ان دونوں سے کم ہیں، اور شش حرفی الفاظ پنج حرفی الفاظ سے کم، اور ہفت حرفی الفاظ ان سب سے بھی کم ہیں، بعاق اور مزنہ دونوں کے معنی بادل کے ہیں، نقاح اور عذب دونوں کے معنی شیرین کے ہیں طلنی، حمقاء، جحیش، اور فرید دونوں ہم معنی ہیں، لیکن بعاق، نقاح، طلنی، اور جحیش غیر فصیح، اور مزنہ، عذب، حمقاء اور فرید فصیح ہیں، جسکی وجہ صرف یہ ہو کہ ان الفاظ کے حروف کم ہیں، اس لئے اُن کے بولنے اور سمجھنے میں انسان کی دماغی قوت کم صرف ہوتی ہے، لیکن اسی کے ساتھ فصیح اور آسان الفاظ کے انتخاب میں چند اصول کا لحاظ رکھنا ضروری ہے،

۱۔ ایک تو یہ کہ جزیل اور ثقیل اور مکروہ الفاظ میں فرق کرنا چاہیے، مثلاً "خَلَقَ" اور "برا" دونوں کے معنی پیدا کرنے کے ہیں، لیکن خلق میں جزالت پائی جاتی ہے، ....

..........ثقل نہیں پایا جاتا، لیکن جزیل اور ثقیل الفاظ میں یہ فرق صرف ذوق سلیم کر سکتا ہے، اس کے لئے کوئی اصول و قواعد مقرر نہیں ہیں،

۲۔ اگر مدح و ذم، امید و آرزو، اور حسرت و افسوس کے اظہار کا موقع پیش آئے، تو اُس موقع پر نرم و شیرین اور قلیل الحروف الفاظ کے بجائے جزیل اور کثیر الحروف الفاظ کو استعمال کرنا چاہیے، مثلاً ایک شاعر کہتا ہے:-

ولا عیب فیھم غیر ان سیوفھم ۔۔۔ بھن فلول من قراع الکتائب

ان میں اور تو کوئی عیب نہیں، البتہ اُن کی تلواروں میں فوجوں کے کھٹکھٹانے سے دندانے پڑ گئے ہیں،

یہ مدح کا موقع ہے، اور اس موقع پر شاندار اور کثیر الحروف الفاظ کا استعمال زیادہ مناسب ہے، اس لئے اگر اس موقع پر قراع کے بجائے اسی کے ہم معنی لفظ "ضرب" یا "ضراب" کا استعمال کیا جائے، تو فصاحت قائم نہیں رہے گی، شاید یہ کہا جائے کہ اوپر یہ اصول تسلیم کیا گیا ہے کہ فصاحت و بلاغت کی بنیاد اس

اصول پر قائم ہے کہ سننے والے کی کم سے کم دماغی قوت صرف ہو، اور اس موقع پر یہ اصول ٹوٹ جاتا ہے، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی وہی اصول قائم ہے، کیونکہ جزیل اور شاندار الفاظ میں دو دلالتیں پائی جاتی ہیں، ایک تو وہ اپنی اصلی وضع کے لحاظ سے اصل معنی پر دلالت کرتے ہیں، دوسرے یہ کہ اس معنی میں جو مبالغہ پایا جاتا ہے اس پر وہ اپنی فطرت یا صفت کی بنا پر دلالت کرتے ہیں، لیکن یہ دونوں دلالتیں ....

ایک ہی وقت میں ایک ہی ساتھ پائی جاتی ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ اس حالت میں سننے والے کی دماغی قوت کم صرف ہوتی ہے، بعینہٖ یہی حالت اُن الفاظ کی ہے جن کے حروف زیادہ ہیں، کیونکہ ان الفاظ کے بولنے میں بولنے والے کو اس کا موقع ملتا ہے کہ وہ اپنی آواز میں اس قدر بلندی اور شان پیدا کر دے جس سے اصلی معنی کے علاوہ اس عظمت و مبالغہ کی تصویر بھی کھینچ دے، جو اصل معنی میں موجود ہیں، بہت سے معنی ایسے ہوتے ہیں جن میں مبالغہ نہیں پایا جاتا، مثلاً پہاڑ میں کسی قسم کا مبالغہ نہیں پایا جاتا، بلکہ ہر پہاڑ کی بلندی، اور وسعت کی پیمایش میل سے کی جا سکتی ہے، اس لئے اس قسم کے معانی کے اظہار کے لئے صرف وضعی الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے بخلاف رنج و مسرت، امید و آرزو، اور حسرت و ندامت میں ضعف و شدّت کے لحاظ سے فرق مراتب ہوتا ہے، اور اس فرق کے ظاہر کرنے کے لئے، صرف وضعی الفاظ کافی نہیں ہوتے، بلکہ طبعی الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ اصل وضع کے لحاظ سے وہ الفاظ اصلی معانی اور اپنی طبعی آواز کے لحاظ سے ان معانی کے شدّت و ضعف پر دلالت کریں، اس سے معلوم ہوا کہ جہاں ان معانی کی شدّت اور قوت کا اظہار مقصود ہو، وہاں جزیل، شاندار، اور کثیر الحروف الفاظ کا استعمال زیادہ موزون ہے،

مانوس الفاظ کا استعمال

فصاحت کی ایک ضروری شرط یہ ہے کہ مانوس الفاظ کا استعمال کیا جائے، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس قسم کے الفاظ کے سننے کے بعد اُن کے سمجھنے کے لئے سننے والے کو اپنی دماغی قوت کم صرف کرنی پڑتی ہے، کیونکہ سننے والا ان الفاظ کے سننے کے بعد انکے معانی کے سمجھنے کے لئے اپنی دماغی قوت کو صرف کرتا ہے، اس لئے الفاظ جس قدر مانوس و کثیر الاستعمال ہونگے، اسی قدر وہ ان کے معانی کو آسانی

کے ساتھ سمجھ سکے گا، اور اس کو اپنی دماغی قوت کم صرف کرنی پڑے گی، مثلاً ایک شخص جو اپنی مادری زبان کے علاوہ کسی دوسری زبان سے بھی واقف ہو، اگر اس کے سامنے ایک ہی مفہوم کو دونون زبانون مین ادا کیا جائے، تو اپنی مادری زبان مین اس مفہوم کے سمجھنے کے لئے اس کو بہ نسبت اجنبی زبان کے کم سے کم دماغی قوت اور کم سے کم وقت صرف کرنا پڑے گا،

الفاظ کی ترکیب | یہ بحث تو مفرد الفاظ سے تعلق رکھتی تھی، لیکن اگر ان الفاظ کو مرکب کرکے ایک جملہ بنایا جائے تو اُس کی متعدد صورتین ہو سکتی ہین، اور اگرچہ ہر صورت مین مفہوم تو ایک ہی ہوگا لیکن فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے تمام صورتین یکسان نہ ہون گی، بلکہ بعض کو بعض پر ترجیح حاصل ہوگی، لیکن اس ترجیح کی وجہ صرف یہ ہوگی کہ جس صورت مین سننے والے کی دماغی قوت کم صرف ہوگی، اسی کو مرجح سمجھا جائے گا، کیونکہ ہر ذہنی صورت مرکب ہوتی ہے، اس لئے ذہن مین اس کے اجزاء کی ترتیب ایسی ہونی چاہئے کہ ہر جزو اپنے مناسب مقام پر ہو، تاکہ دماغ اُس کو تھوڑی سی مدت اور تھوڑی سی زحمت کے بعد دیکھ سکے، اب اگر الفاظ کی ترتیب و ترکیب بھی اسی ذہنی صورت کی ترتیب و ترکیب کے مطابق ہوگی، تو سننے والے کو اس کے سمجھنے مین کم سے کم دماغی قوت صرف کرنی پڑے گی ؛

مثلاً یہ دو جملے ہین :-

قدمت سود الرّایات، سیاہ جھنڈے آئے،

قدمت الرایات السود، سیاہ جھنڈے آئے،

اور دونون کا مفہوم ایک ہی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ پہلے جملہ مین صفت کو موصوف پر اور دوسرے جملہ مین موصوف کو صفت پر مقدم کیا گیا ہے، اب سوال یہ ہو کہ فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے اُن مین کونسا جملہ بہتر ہے ؟ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ اُن مین پہلا جملہ جس مین صفت کو موصوف پر مقدم کیا گیا ہے، بہتر ہے کیونکہ

۱۔ صفت عام اور موصوف خاص ہوتا ہے، اس لئے جب عام و خاص دونون ایک جگہ جمع ہو جاتے ہین اور تقدیم و تاخیر مین ہر حیثیت سے برابر ہون، تو عام کو خاص پر مقدم کرنا بہتر ہے، کیونکہ وہ دماغ کو خاص کے تصور کرنے پر آمادہ کر دیتا ہے،

۲۔ موصوف کو صرف صفت کے ذریعہ سے معلوم کیا جا سکتا ہے، یعنی سب سے پہلے ہم کو موصوف کی صفت مثلاً اس کا رنگ اور اس کی شکل نظر آتی ہے، اس لئے صفت کا مقدم کرنا، اس کے حقیقی ادراک کے مطابق ہے، اس لئے وہ زیادہ بلیغ ہے،

اب اگر بلاغت کے اس عام اصول کو کہ اس مین سننے والے کی کم سے کم دماغی قوت صرف ہونی چاہئے، پیش نظر رکھا جائے، تو معلوم ہوگا کہ اس جملے مین صفت ہی کا مقدم رکھنا زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس جملہ مین،

قدمت سود الرایات سیاہ جھنڈے آئے،

جب سننے والا "سود" کے لفظ کو سنے گا، تو موصوف کا تصور فوراً ہی اس کے ذہن مین آ جائے گا، اس لئے جب اس کے بعد موصوف کا ذکر آئے گا، تو وہ اس کو اس کی صفت کے ساتھ فوراً ملا لے گا، گویا وہ موصوف کی حقیقی خارجی صورت مین اس کو دیکھ رہا ہے، اس کے بخلاف دوسرے جملے یعنی

قدمت الرایات السود سیاہ جھنڈے آئے،

مین جب وہ "رایات" کے لفظ کو پہلے سنے گا، تو اوس کا دماغ اس لفظ کے معنی کی طرف متوجہ ہوگا، اور اس کے ذہن مین جھنڈا اسی رنگ کے ساتھ آئے گا، جو عام طور پر جھنڈون کا ہوتا ہے، اس لئے پہلے جب بعد "سیاہ" کے لفظ کو سنے گا تو اس کو اپنے دماغ سے جھنڈے کے پہلے رنگ کو نکالنا، اور اُس کی جگہ دوسرے رنگ کو قائم کرنا ہوگا، اس لئے دماغ کو دو کام کرنے مین زیادہ قوت صرف کرنی پڑیگی، اس کے بخلاف صفت کے مقدم کرنے مین دماغ کو کم قوت صرف کرنی ہوگی، اس لئے پہلا جملہ زیادہ

بلیغ ہوگا،

تشبیہ

ارکانِ بلاغت مین تشبیہ ایک اہم رکن ہے، اور اس کا تمام تر دار و مدار فصاحت و بلاغت کے اسی عام اصول پر ہے، کہ اس مین ایک مفہوم کے سمجھنے کے لئے سننے والے کو کم سے کم دماغی قوت صرف کرنی پڑتی ہے، مثلاً اگر ہم کو یہ کہنا ہو کہ "زید نہایت بہادر ہے" اور اس کو ہم یون کہین کہ "زید مثل شیر کے ہے" تو اس دوسرے جملے سے شجاعت کا مفہوم بہ نسبت پہلے جملے کے زیادہ وضاحت اور زیادہ آسانی کے ساتھ ہمارے ذہن مین آئے گا، اور یہ اصول تشبیہ کے تمام اغراض و مقاصد پر صادق آتا ہے، مثلاً تشبیہ کا ایک مقصد یہ ہے کہ کسی چیز کو عمدہ شکل مین پیش کیا جائے، جیسا کہ ایک شاعر کہتا ہے،

لہ خال علی صفحات خد　　　کقطعۃ عنبر فی صحن مرمر

اس کے رخسارے کے صفحات پر ایک تل ہے، جس طرح عنبر مرمر کے صحن مین ہوتا ہے،

عام طور پر ہر شخص کو معلوم ہے کہ عنبر ایک خوشبودار اور قیمتی چیز ہے، اسی طرح سنگِ مرمر بھی ایک صاف و شفاف قیمتی پتھر ہے، اس لئے ان دونون تشبیہون کے ذریعہ سے معشوق کے خال و رخسار کی جو خوبی ہمارے ذہن مین آئے گی، وہ حقیقی الفاظ کے ذریعہ سے نہ آسکے گی، تشبیہ کا ایک مقصد یہ ہے کہ مشبہ کے کسی وصف کی مقدار بتائی جائے، مثلاً ایک شاعر کہتا ہے،

فیھا اثنتان و اربعون حلوبۃً

سوداً کخافیۃ الغراب الاسحم

اس مین وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے، کہ اونٹنیان سیاہ رنگ کی تھین، لیکن سیاہی کی مقدار مختلف ہوتی ہے، اس لئے اس نے تشبیہ کے ذریعہ سے اس سیاہی کی مقدار متعین کر دی اور یہ بتا دیا کہ ان مین اسی قدر سیاہی تھی، جس قدر کوے کے پر مین ہوتی ہے، لیکن اگر وہ تشبیہ کے ذریعہ سے اس مقدار کو متعین نہ کر دیتا، تو یا تو سننے والے کو یہ مقدار ہی نہ معلوم ہوتی، یا اوس کے متعین کرنے مین اس کا دماغ بھٹکتا پھرتا،

اور اس کا بہت سا وقت صرف ہوتا،

تشبیہ کا ایک مقصد مشبہ کا امکان ثابت کرنا ہے، یعنی سننے والا اس کے امکان مین شک کرتا ہے، اور شاعر تشبیہ کے ذریعہ سے اسی شک کو زائل کرتا ہے،

مثلاً متنبی کہتا ہے،

فان تفق الانام و انت منھم

اگر تو مخلوقات پر تفوق رکھتا ہے، حالانکہ تو بھی ان ہی مخلوقات مین شامل ہو

فان المسک بعض دم الغزال

تو یہ کوئی تعجب انگیز بات نہین، کیونکہ مشک بھی ہرن کے خون ہی کا ایک جزو ہوتا ہے،

یعنی مشک اگرچہ ہرن ہی کے خون کا ایک جزو ہوتا ہے، تاہم وہ اپنے مخصوص اوصاف کی بنا پر خون پر تفوق رکھتا ہے، اسی طرح ممدوح بھی اگرچہ مخلوقات مین شامل ہے، لیکن اپنے مخصوص اوصاف کی وجہ سے ان پر تفوق رکھتا ہے، لیکن اگر متنبی اس پر دلائل قائم کرتا، تو اس کو بڑی طوالت بیانی سے کام لینا پڑتا، مگر تشبیہ نے نہایت اختصار کے ساتھ اس شک کو دور کر دیا، اور ظاہر ہے کہ اس مین سننے والے کی دماغی قوت کس قدر کم صرف ہوئی،

غرض تشبیہ کے جس قدر اغراض و مقاصد ہین، سب مین اختصار پایا جاتا ہے، اس لئے اس مین سننے والے کو دماغی قوت کم صرف کرنی پڑتی ہے،

استعارہ

استعارہ بھی تشبیہ ہی کی ایک قسم ہے، لیکن اس مین اور بھی زیادہ اختصار پایا جاتا ہے، کیونکہ اس مین صرف مشبہ بہ کو بیان کرتے ہین، اور مشبہ اور حرف تشبیہ کو حذف کر دیتے ہین، اس لئے اس مین سننے والے کو اور بھی کم دماغی قوت صرف کرنی پڑتی ہے،

مجاز مرسل

مجازِ مرسل مین بھی بلاغت وہین زیادہ پائی جاتی ہے، جہان سننے والے کو کم سے کم

دماغی قوت صرف کرنی پڑتی ہے، مثلاً

وما من ید الا ید اللہ فوقھا

کوئی ایسا ہاتھ نہین جس کے اوپر خدا کا ہاتھ نہ ہو

ولا ظالم الا ویبلی باظلم

اور کوئی ظالم نہین ہے جس کو اُس سے بھی زیادہ ظالم سے کام نہ پڑے

اس شعر مین مجازاً "ید" یعنی ہاتھ سے قوت وغلبہ مراد ہے لیکن قوت وغلبہ کے تصور سے ہاتھ کا تصور زیادہ آسانی سے ہو سکتا ہے، کیونکہ ہاتھ ایک محسوس چیز ہے، جس کا تصور بذاتہ ہوتا ہے، لیکن قوت اور غلبہ معنوی چیزین ہین، اس لئے اُن کے تصور مین ایک واسطہ کی ضرورت ہوتی ہے،

کنایہ تشبیہ واستعارہ کی طرح کنایہ کی بلاغت کا سبب بھی یہی ہے کہ اس مین سننے والے کو کم سے کم دماغی قوت صرف کرنی پڑتی ہے، کیونکہ معانی کلیہ ہمیشہ جزئیاتِ محسوسہ سے منتزع کئے جاتے ہین، اس لئے جب تک یہ جزئیات موجود نہ ہون، ان معانی کا تصور واضح طور پر نہین ہو سکتا، مثلاً فیاضی ایک عام مفہوم ہے، اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ "زید فیاض ہے" تو فیاضی کا یہ مفہوم اس وقت تک واضح طور پر ذہن مین نہین آسکتا، جب تک یہ نہ دکھایا جائے، کہ زید ایک محتاج یا سائل کو عطیہ دے رہا ہے، یا مہمان نوازی کر رہا ہے، اور اگر بالفرض یہ مفہوم ذہن مین بھی آ جائے تو اس سے یہ معلوم نہین ہو سکتا، کہ ان حالات مین زید کی فیاضی کی مقدار کیا تھی؟ اوس نے یہ فیاضی مسرت کے ساتھ کی تھی، یا ناگواری کے ساتھ؟ بہر حال یہ مفہوم اس سادہ جملہ سے اس وقت تک ذہن مین نہین آسکتا، جب تک سننے والا اپنے ذہن مین زید کا تصور اس طرح نہ کرے کہ وہ عطیہ دے رہا ہے، اور مہمان نوازی کر رہا ہے، اور اس حالت مین وہ نہایت شادان و فرحان ہے، لیکن

اس سادہ جملے سے اس مفہوم کے سمجھنے مین دماغ کو جبراً غیر معمولی قوت سے کام لینا پڑتا ہے، پھر بھی یہ مفہوم اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ ذہن کے سامنے واضح طور پر نہین آتا، اس کے برخلاف اسی مفہوم کو ایک شاعر کنایۃً اس طرح ادا کرتا ہے،

عمرو العلی ذو الندی من لا یسابقہ مر السحاب ولا ریح یجاریہ

فیاض عمرو العلاء ایک ایسا شخص ہے جسکے آگے نہ گذرنے والا بادل بڑھ سکتا ہے اور نہ ہوا اسکا مقابلہ کر سکتی ہے

اجفانہ کالجوابی للوفود اذا لبوا بمکۃ نادھم منادیہ

اس کے پیالے وفود کے لئے حوض کے مثل ہین جب اس کے پکارنیوالے کی آواز پر وہ مکہ مین لبیک کہتے ہین

اذا محلوا اخصبوا منھا وقد ملئت قوتاً لحاضرہ منھم وبادیہ

یا قحط زدہ ہون تو ان پیالون سے سیر ہو جاتے ہین، جن مین شہریون اور بدویون دونون کے لئے روزی بھری ہوئی ہوتی ہے،

شاعر نے ان اشعار مین صرف اسی قدر نہین کہا کہ "عمرو العلاء فیاض ہے" اور اگر وہ صرف اسی قدر کہتا تو اس کے کلام مین کوئی بلاغت نہ پیدا ہوتی، بلکہ فیاضی کے ساتھ اس نے یہ بھی دکھایا کہ وہ نہایت تیزی کے ساتھ فیاضی کرتا ہے، اس کے پیالے جن مین کھانا رکھا ہوا ہے، حوض کی طرح بڑے ہین، اُس نے بہت سے منادی مقرر کئے ہین، جو سائلون کو پکار کر مکہ کی طرف بلاتے ہین، وہ ہمیشہ یہان تک کہ قحط کے زمانہ مین بھی فیاضی کرتا ہے، ان تمام جزئیات سے اس کی فیاضی کی صورت نہایت وضاحت کیساتھ ذہن مین آجاتی ہے، اور عمرو العلاء کی عظمت کا سکہ دلون مین بیٹھ جاتا ہے،

کلام کا اثر جب کوئی شخص کسی عبارت کو سنتا ہے تو صرف اُس کے معانی ومطالب ہی کو نہین سمجھتا بلکہ اس سے متاثر بھی ہوتا ہے، اس لئے اُس کو ایک ہی ساتھ دو قوتون سے کام لینا پڑتا ہے، ایک تو اُس کے سمجھنے کی قوت، دوسرے، اس سے متاثر ہونے کی قوت اس لئے معانی ومطالب کے سمجھنے مین جسطرح

بلاغت کا تمام تر دارومدار اس پر ہے کہ سننے والے کی دماغی قوت کم سے کم صرف ہو اسی طرح اس کلام سے متاثر ہونے کا دارمدار بھی اسی اصول پر ہے، لیکن اس کے سمجھنے کے لئے پہلے چند بدیہی اصول کو سمجھ لینا چاہئے

۱- ایک تو یہ کہ قوتِ متاثرہ جب اوّل اوّل کسی مفہوم سے متاثر ہوتی ہے تو وہ ضعف و قوت کی ایک خاص حالت مین ہوتی ہے، اس کے بعد جب وہ کسی دوسرے مفہوم سے متاثر ہوتی ہے، تو اس وقت اس مین ضعف و قوت کی جو حالت پائی جاتی ہے، وہ پہلی حالت سے مختلف ہوتی ہے، لیکن بلاغت کا دارمدار تمام تر اسی دوسری حالت پر ہوتا ہے اس لئے بعد کے اثرات جس قدر سخت ہون گے، اسی قدر وہ عبارت بلیغ ہوگی، ورنہ اگر یہ اثر ضعیف ہوگا، تو سننے والے کو ناگواری محسوس ہوگی،

۲- دوسرا یہ کہ جسمانی اور عقلی قوتون کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی طبعی حالت مین جب مصروفِ عمل ہوتی ہین، تو ابتدا مین نہایت قوی ہوتی ہین، پھر جب اس کام مین برابر مشغول رہتی ہین، تو ان مین بتدریج ضعف پیدا ہوتا ہے، یہان تک کہ جب یہ ضعف حد سے بڑھ جاتا ہے، تو تھک کر بالکل بیکار ہو جاتی ہین، مثلاً اگر تم ایک خوشبودار پھول کو برابر سونگھتے رہو، تو بتدریج اس کی خوشبو کم ہوتی جائے گی، یہان تک کہ اخیر مین خوشبو کا احساس ہی باقی نہ رہے گا، کچھ دیر تک شہد کو چاٹتے رہو، اس کے بعد اسکی پہلی شیرینی باقی نہ رہے گی، اگر تمھارے پاس سے ایک جماعت شور و غل کرتی ہوئی گذرے، تو پہلے اس کے شور و غل سے تم کو سخت تکلیف ہوگی لیکن بعد کو تکلیف کا احساس کم ہو جائے گا، چنانچہ مشہور یہ ہے کہ ابتدائی معرکہ کے بعد فوجون کو توپ اور بندوق کی آواز ہی محسوس نہین ہوتی، اگر تم ایک حمام مین داخل ہو تو پہلے شدت کے ساتھ اس کی حرارت محسوس ہوگی، پھر بتدریج یہ احساس کم ہوتا جائیگا، یہان تک کہ اخیر مین یہ احساس ہی زائل ہو جائے گا،

غرض تمام احساسات کا یہی حال ہے کہ وہ ابتدا مین نہایت شدید ہوتے ہین، پھر رفتہ رفتہ ان مین کمی ہوتی جاتی ہے، یہان تک کہ اخیر مین وہ احساس ہی زائل ہو جاتا ہے لیکن جس طرح جسمانی اور

دماغی قوتین فطرةً برابر مشغول عمل رہنے سے تھک جاتی ہین، اسی طرح وہ پہلی حالت کی طرف لوٹنا چاہتی ہین یعنی کم ہو جانے کے بعد وہ مزید قوت حاصل کرنا چاہتی ہین، اور یہ مزید قوت آناً فاناً جدید غذا کے پہونچنے سے حاصل ہوتی ہے، لیکن اس کمی کے پورا کرنے کے لئے بہت زیادہ طویل مدت کی ضرورت نہین ہوتی، بلکہ تھوڑا سا وقفہ بھی اس کمی کو پورا کر دیتا ہے، بلکہ اکثر یہ کمی اور زیادتی ساتھ ساتھ ہوتی ہے کیونکہ برابر مشغول عمل رہنے سے قوت مین جو ضعف و انحلال پیدا ہو جاتا ہے، اور اس کے بعد جدید غذا کے پہونچنے سے اوس مین جو نشاط پیدا ہو جاتا ہے، وہ دونون ایک ہی وقت مین ہوتے ہین، یہی وجہ ہے کہ جو قوتین ہمیشہ مشغول عمل رہتی ہین، مثلاً حواس ظاہری اُن مین اعتدال عمل کی حالت مین یہ کمی و زیادتی ایک ہی ساتھ ہوتی رہتی ہے، اس لئے ان قوتون مین جو کمی پیدا ہو جاتی ہے، وہ اس وقت محسوس ہوتی ہے جب وہ اپنے عمل مین ایک طویل زمانے تک مشغول رہین، یا یہ کہ وہ عمل اس قدر سخت ہو کہ قوت کی کمی زبردستی سے پوری کی جائے،

ان دونون اصول سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک شاعر یا ایک انشا پرداز کو ہمیشہ اپنے کلام مین تغیر پیدا کرتے رہنا چاہئے، تشبیہ، استعارہ، مبالغہ، سجع غرض کہ تمام محاسن کلام گو کتنے ہی عمدہ ہون، لیکن اگر وہ برابر ایک ہی قسم کی تشبیہ، استعارہ مبالغہ، اور سجع کو استعمال کرتا رہے گا، تو سننے والے کو ناگواری پیدا ہوگی، اور اس پر ان چیزون کا کوئی اثر نہ پڑے گا، مثلاً مبرد کی کتاب الکامل اور مقامات حریری دونون ادبی کتابین ہین لیکن کتاب الکامل کے پڑھنے سے پڑھنے والے کو کوئی ناگواری محسوس نہین ہوتی، اس کے بخلاف مقاماتِ حریری کے پڑھنے سے اس کو وہ نشاط محسوس نہین ہوتا، جو کتاب الکامل کے پڑھنے سے ہوتا ہے، اور اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ کتاب الکامل کی تمام فصلین ایک دوسرے سے مختلف ہین، اور اس کے اسلوب بیان مین تنوع پایا جاتا ہے، اس کے بخلاف مقاماتِ حریری کا طرز بیان ایک ہی ہے، اور اس کے تمام مقامات یکسان طور پر مسجع و مقفّٰی ہین، اس لئے جب ایک مقامہ کو پڑھ کر قوتِ متاثرہ

تھک جاتی ہے، تو مزید نشاط پیدا کرنے کے لئے اُس کو جدید غذا نہین ملتی،

۳۔ تیسرا یہ کہ اگر دو موثر ہون جن مین ایک ضعیف اور دوسرا قوی ہو، اور سب سے پہلے دماغ پر ضعیف موثر کا اور اس کے بعد قوی موثر کا اثر پڑے، تو وہ دونون کے اثرات اور ان کی باہمی نسبت کو علٰحدہ علٰحدہ محسوس کرے گا، اس کے بخلاف اگر اس پر پہلے قوی موثر کا اس کے بعد ضعیف موثر کا اثر پڑے، تو وہ ضعیف موثر کے اثر کو سرے سے محسوس ہی نہین کرے گا، مثلاً اگر تم ایک گلاب کے پھول کو پہلے سونگھ کر اس کے بعد گلاب کے عطر کو سونگھو تو تم کو دونون کی خوشبوئین، اور اُن کی باہمی نسبت علٰحدہ علٰحدہ محسوس ہون گی، اس کے بخلاف اگر تم گلاب کے عطر کو سونگھ کر گلاب کے پھول کو سونگھو، تو تم کو گلاب کے پھول کی خوشبو ہی محسوس نہ ہوگی، اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالین ہین، اور اُن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک شاعر یا ایک انشاپرداز کو ایک شعر سے دوسرے شعر اور ایک جملہ سے دوسرے جملہ کی طرف منتقل ہونے مین خوب سے خوب تر کی طرف، واضح سے واضح تر کی طرف، سبب بعید سے سبب قریب کی طرف، منبہ سے موثر کی طرف اور موثر سے مہیج کی طرف ترقی کرنی چاہئے، کیونکہ پہلا شعر یا پہلا جملہ جو صرف خوب، واضح اور منبہ تھا، اس کو دوسرے خوب تر، واضح تر، موثر اور مہیج سے وہی نسبت ہے، جو گلاب کے پھول کو گلاب کے عطر سے تھی، اس لئے گلاب کے پھول کا سونگھنا جو موثر ضعیف ہے، گلاب کے عطر کی خوشبو کے محسوس کرنے کے لئے جو موثر قوی ہے، دماغ کو اور بھی زیادہ تیار کر دیتا ہے، اسی طرح ایک عمدہ شعر یا ایک عمدہ جملہ دماغ کو اس سے عمدہ شعر، اور عمدہ جملے سے متاثر ہونے کے لئے اور بھی زیادہ تیار کر دیتا ہے، لیکن اس کے برعکس جس طرح گلاب کے عطر کے سونگھنے کے بعد اگر گلاب کے پھول کو سونگھا جائے تو سرے سے اس کی خوشبو ہی محسوس نہ ہوگی، اس لئے اگر ایک عمدہ شعر یا عمدہ جملے کے بعد اس سے کم درجہ کا شعر اور کم درجہ کا جملہ لایا جائے، تو سرے سے اس کا کوئی اثر ہی نہین ہوگا،

اسکی بہترین مثال موسیٰ بن طارق فاتح اندلس کا وہ خطبہ ہے جس کو اوس نے اپنی فوج کے سامنے

نہر طارق کو عبور کرنے کے بعد دیا کیونکہ جب اوس نے نہر کے عبور کرنے کے بعد دیکھا کہ دشمنون کی بہت بڑی تعداد تمام جنگی سامان کے ساتھ مسلح ہو کر سامنے کھڑی ہے، تو سب سے پہلے اپنی فوج کے سامنے اپنے تمام جہاز جلا دیے، جس سے اون کی مایوسی کا جذبہ اس قدر بیدار ہو گیا، جو تقریر کرنے سے بیدار نہین ہو سکتا تھا اس کے بعد ان کے جذبۂ شجاعت کے اُبھارنے کے لئے ایک تقریر کی جس کے الفاظ یہ تھے :-

"اے اسلام اور دین کے حامیو! سمندر تمھارے پیچھے اور دشمن تمھارے سامنے ہے، اب تم کو صرف تلوار کی دھار سے نجات مل سکتی ہے"؛

اس سے زیادہ اوس نے اور کچھ نہین کہا لیکن اس کا نتیجہ اس یادگار فتح کی صورت مین نکلا جس پر اب تک تاریخ ناز کرتی ہے،

اسی طرح ایک مورخ اگر کسی عظیم الشان تاریخی واقعہ کو بیان کرنا چاہتا ہے، تو سب سے پہلے اوس کے ابتدائی اسباب کو بیان کرنا چاہئے، اس کے بعد ان اسباب کو بیان کرنا چاہئے، جو ابتدائی اسباب کے بعد پیدا ہوئے، سب سے اخیر مین اس سبب کو بیان کرنا چاہئے، جو واقعہ کے پیدا ہونے کا سب سے قریبی سبب تھا، اس طرح اس کی تاریخ کا پڑھنے والا ہر سبب کو علٰحدہ علٰحدہ سمجھ لے گا، اور ایک سبب کو دوسرے اسباب سے جو نسبت تھی وہ بھی اس کی سمجھ مین آجائے گی، اور واقعہ کی پوری حقیقت نہایت وضاحت کیساتھ اس کے ذہن مین آجائے گی، اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح ایک موثر ضعیف موثر قوی کے اثر سے متاثر ہونے کے لئے دماغ کو آمادہ کر دیتا ہے، اسی طرح ایک سبب بعید سبب قریب سے متاثر ہونے کیلئے دماغ کو زیادہ مستعد کر دیتا ہے، غرض صرف مفرد الفاظ کی فصاحت، عبارت آرائی اور تشبیہات و استعارات، کی کثرت پر بلاغت، کا دار و مدار نہین ہے، بلکہ اوس کے اور بھی وجوہ و اسباب ہین،

۴۔ چوتھا یہ کہ دو متضاد چیزین باہم ایک دوسرے کی وضاحت نہایت شدت کے ساتھ کرتی ہین،

مثلاً ایک سفید نقطہ کی سفیدی سیاہ کاغذ پر اور ایک سیاہ نقطہ کی سیاہی سفید کاغذ پر زیادہ نمایان طور پر نظر آتی ہے، اس لئے اگر کسی شخص کی فیاضی کی تعریف کرنا ہو تو اس کا مقابل پہلو یعنی ایک بخیل شخص کے بخل کا دکھلانا اوس کی فیاضی کو اور زیادہ نمایان کر دے گا، مثلاً

لشتان ما بین الیزیدین فی الندی　　یزید سلیم والاغر بن حاتم

دونون یزید یعنی یزید سلیم اور اغر بن حاتم کی فیاضی مین بڑا اختلاف ہے،

فہم الفتی الازدی اتلاف مالہ　　وہم الفتی القیسی جمع الدراہم

ازدی جوان کا کام اپنے مال کا ضائع کرنا اور قیسی جوان کا کام روپیہ پیسہ کا جمع کرنا ہے

فلا یحسب التمتام انی ھجوتہ　　ولکننی فضلت اھل المکارم

یہ نہ خیال کرنا چاہئے کہ مین نے اوس کی ہجو کی ہے، بلکہ صرف اہلِ مکارم کو ترجیح دی ہے،

اس لئے اگر کسی وصف یا کسی حالت کے بیان کرنے سے دماغ یا دل کو شدت سے متاثر کرنا ہو مثلاً امیرون اور غریبون کی زندگی کی حالت بیان کرنا ہو تو سب سے پہلے امیرون کے عیش و تنعم کا ذکر کرنا چاہئے اس کے بعد فقراء کی حالت زار کو بیان کرنا چاہئے،

مناجاتِ مقبول

(مع شرح)

حکیم الامۃ، مجدد ملت علامہ اشرف علی تھانوی کا انتخاب کیا ہوا دو سو سے اوپر قرآنی اور حدیثی دعاؤن کا مجموعہ مع ترجمہ و شرح، از عبدالماجد دریابادی صاحب تفسیر القرآن (اردو انگریزی)، مدیر صدق لکھنو، قیمت:- عہ

ملنے کے پتے:-

۱- صدق بک ایجنسی گولہ گنج لکھنو، ۲- دار المصنفین اعظم گڈھ، ۳- انوار بک ڈپو امین آباد پارک لکھنو

"منیجر"

اقبال و نیطشے

از

جناب ڈاکٹر عشرت حسن صاحب انور، ایم اے، پی، ایچ، ڈی لکچرار فلسفہ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ،

(۲)

برگسان کو جب ذاتِ نفس کا وجدان میسر ہوا، تو اس نے کہا تھا کہ ذاتِ نفس ایک سلسلۂ جذبات، احساسات و ادراکات وغیرہ ہے، اور چونکہ درونِ سینہ کی زندگی ہر لحظہ منقلب و متغیر ہے، اس لئے کسی جذبہ یا خیال یا ادراک کو ثابت یا ساکن ماننا بھی غلط ہے، ہر ایک احساس دوسرے احساسات و جذبات سے منسلک و مربوط ہے، اور کسی ایک جذبہ کو "ایک" کہنا یا اُس کے حدود مقرر کرنا ناممکن ہے، کوئی نہین کہہ سکتا کہ کونسا جذبہ یا احساس، یا ادراک کہان سے شروع ہوا، اور کب شروع ہوا، یا کہان ختم ہوا، اور کب ختم ہوا، درونِ سینہ کی زندگی مین کوئی حالت کوئی "ایک حالت" کہلائے جانے کے قابل نہین جس کو ہم "ایک حالت" کے نام سے تعبیر کرتے ہین، وہ خود ہر لحظہ (اور لحظہ خود کوئی ساکن اور غیر متحرک لحظہ نہین ہے) متغیر ہو رہی ہے، اور عام دوسرے احوال و احساسات مین سرایت کیے ہوے ہے،

اس طرح وجدان کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے کہ ذات نفس ایک مسلسل بہاؤ، ایک پیہم متزلزل و منقلب احساسات و حالات کا سلسلہ ہے، یہ کوئی نہین بتا سکتا کہ یہ تغیر و تبدل کا سلسلہ کب شروع ہوا، ہماری پیدایش کے وقت سے یہ سلسلہ تغیر برابر جاری ہے، اسی سلسلہ انقلاب کی بنا پر ہمارے موجودہ حالات و احساسات متعین ہو رہے ہین، دوسرے الفاظ مین ہمارا "تمام ماضی" ہمارے "حال" مین موجود ہے، اور

ایک طرح سے ماضی و حال کا امتیاز ہی غلط ہے، نہ ماضی درحقیقت ماضی ہے، اور نہ حال، حال، درون سینہ تو بس ایک سلسلہ موجود ہے، جس مین ماضی، حال، مستقبل سب زمانے بیک وقت موجود ہین، ماضی حال سے غیر متعلق نہین ہو، اسی طرح یہ تمام نہاد "حال" "مستقبل" سے بھی کوئی علٰحدہ حقیقت نہین رکھتا، کیونکہ درون سینہ ایک پیہم سلسلۂ تغیر و تبدل جاری ہے، یہ سلسلۂ تغیر و تبدل اور متحرک انقلاب کا سلسلہ ہماری پیدائش کے بعد ہی نہین، بلکہ اس سے بھی ہزارہا سال پہلے سے شروع ہو چکا ہے، اور برابر جاری ہے، اور اسی کی بنا پر نئے نئے وجود ظہور پذیر ہو رہے ہین، اور نئی نئی جنین وجود مین آ رہی ہین، ہر لحظہ ہم ہی نہین تمام کائنات نئے نئے احوال کی حامل ہے، یہ احوال بظاہر ساکن اور غیر متحرک نظر آتے ہین، مثلاً ہم کہتے ہین کہ یہ شخص بچہ ہے، گویا بچپن کوئی ٹھہری ہوئی اور غیر متحرک حقیقت ہے، لیکن کیا بچپن ہر لحظہ منقلب اور متغیر نہین ہو رہا ہے، اگر بالفرض متغیر نہین ہو رہا ہے، تو پھر لڑکپن کس طرح آ سکتا ہے، لڑکپن کا ورود ہی خود اس بات کا شاہد ہے کہ بچپن مین سلسلۂ تغیر احوال برابر جاری ہے، اور جب یہ تغیرات معتد بہ اور نمایان ہو گئے، تو یہ سمجھا گیا کہ لڑکپن شروع ہوا، اگر لڑکپن خود کوئی غیر متحرک حقیقت نہین ہے، یہ خود ہر لحظہ منقلب اور تبدل اور پیہم سلسلۂ انقلاب کا حامل ہے، اور اس سلسلۂ انقلاب ہی کی بنیاد پر ایک مقام پر پہنچ کر (اور یہ مقام خود ہر لحظہ دگرگون ہے) کہا جاتا ہو کہ لڑکپن ختم ہوا، اور جوانی شروع ہوئی، لیکن جوانی بھی ہر لحظہ تبدل ہے، یہ خود کوئی ساکن، ثابت، اور غیر متحرک حقیقت نہین، اگر بالفرض اس کو غیر متحرک اور ثابت مان لیا جائے، تو پھر زندگی کا سلسلہ یہیں ختم ہو جانا چاہیئے، اور اس کو بڑھاپے سے قطعی طور پر غیر متحرک تصور کرنا لازم نہ ہوگا، مگر بڑھاپا جوانی سے غیر متعلق نہین ہے، اور وہ جوانی کے ہی ہر لحظہ منقلب ہونے کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتا ہے، اگر جوانی ہر لحظہ منقلب اور دگرگون نہ ہوتی رہتی تو کسی طرح بھی بڑھاپے سے نہ بدلتی، اس لئے بڑھاپا دراصل جوانی کیا بچپن ہی کے سلسلہ کا ایک حلقہ ہے، جو خود بھی ہر لحظہ متحرک اور منقلب ہوتا ہے،

اب پھر بچپن پر غور کیجئے کہ وہ خود ایک اور سلسلۂ انقلابِ احوال سے متعلق ہے جس کا تعلق ہمارے اس صلبی وجود سے ہے، جو ماں باپ کی پشت سے متعلق ہے، اسی طرح اس موخر الذکر سلسلۂ انقلابِ احوال کا تعلق کسی اور سلسلۂ تغیرات سے ہونا ضروری ہے، اس لئے ہم کو بالآخر ایک ایسا مرجعِ تغیرات و انقلاب تسلیم کرنا ہوگا، جو ازل سے ہو اور ابد تک قائم رہے، اور اس ضمن مین ازل اور ابد بھی محض ذہنی اعتبارات کے جا سکتے ہین، ورنہ وہ بھی درحقیقت کوئی ثابت و ساکن منزلین نہین،

برگسان اس ازلی اور ابدی سلسلۂ تغیراتِ احوال کو "زورِ زندگی" (Elan Vital) کے نام سے تعبیر کرتا ہے، اسی زورِ زندگی کے سارے کرشمے ہین، یہی "زورِ زندگی" جو ہر لحظہ منقلب اور دگرگون ہوتا ہوا ان حالات و کیفیات و تغیرات تک پہنچا ہے، جس کو آج (اور آج خود کوئی ٹھہرا ہوا زمانہ نہین ہے بلکہ پیہم منقلب ہو، اور اس طرح بہ رہا ہے کہ دمبدم آگے بڑھ رہا ہے) مجموعی طور پر ہماری یا آپ کی یا کسی اور انسان یا حیوان کی ذات سے تعبیر کیا جاتا ہے،

اس مسئلہ مین ایک خاص عرصہ کے لئے اقبال برگسان کے ہم خیال رہے، یہ غالباً وہ زمانہ تھا جب کہ اُن کو خود وجدانِ ذات میسر نہین ہوا تھا، اس زمانہ مین وہ وحدت الوجود کے بڑے حامی تھے، برگسان کی طرح اُن کا بھی خیال تھا کہ تمام چیزون کی اصل حقیقت ایک ہے، اور وہ "زورِ زندگی" ہے، بانگِ درا مین اس قسم کے اشارات بہت واضح ہین مثلاً:-

کثرت مین ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی — جگنو مین جو چمک ہو وہ پھول مین مہک ہو

اس وقت اقبال اور وحدت الوجود کے دوسرے حامیون مین کوئی فرق نہیں تھا، اگر کچھ تھا تو صرف "وحدت" کے تصور مین ہے، وحدت الوجودی صوفیائے کرام نے اس وحدت کو اللہ اور خدا کے نام سے تعبیر کیا ہے، اور اقبال اُس کو برگسان کے خیالات کے اثر سے "زورِ زندگی" "شورِ زندگی" "رمِ زندگی" "یمِ زندگی" وغیرہ کے الفاظ سے تعبیر کرتے تھے،

لیکن وحدت کو جس شکل مین بھی تصور کرین، بہر حال دونون مذکورہ بالا دبستان خیال سے ایک ہی طرح کے نتائج نکلتے ہین، مثلاً اگر زور زندگی ہی ایک واحد حقیقت ہے، تو ذات نفس کو ایک غیر حقیقی، اور صرف اعتباری وجود ماننا پڑے گا کہ وہ ایک سایہ کی طرح ہے، جو زور زندگی کا محتاج ہے، یا حباب کی طرح سمندر کے تلاطم کا محتاج ہے، جو آج ہے اور کل نہین رہے گا، فانی ہے جاودانی نہین وغیرہ وغیرہ نیز اگر زور زندگی ہی حقیقت ہے اور ہمارے موجودہ احوال اسی سلسلۂ زندگی کے تابع ہین، تو پھر ہماری خود مختاری اور آزادی بالکل ختم ہوجاتی ہے، اور یہ ماننا پڑے گا کہ آج ہم جو کچھ کر رہے ہین، اس پر ہم کو سلسلۂ تغیرات زندگی نے مجبور کر دیا ہے، برگسان کے اس خیال مین کہ درون سینہ کی زندگی آزاد اور ہر لحظہ تخلیق کی حامل ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو کسی حد تک تضاد پایا جاتا ہے، کیونکہ ہم اور آپ کسی طرح بھی آزاد اور خود مختار نہین، اگر بالفرض کوئی آزاد اور خود مختار ہے بھی تو وہ "زور زندگی" ہے، افراد نہین" اگر موجودہ نفسیاتی احوال زمانہ ماضی (جو کسی طرح ماضی نہین ہے) کے سلسلۂ احوال سے منسلک ہین تو پھر ہماری آپ کی سب کی زندگی پابند ہے، آزاد نہین، اس کو برگسان کی طرح آزاد کہنا محض شاعرانہ انداز بیان ہے،

اقبال برگسان کے فلسفہ کے خطرناک نتائج پر ایک عرصہ تک غور و فکر کرتے رہے لیکن برگسان نے چونکہ اپنے تمام فلسفہ کی بنیاد وجدان پر رکھی تھی، اس لئے اُس کی تردید کرنا آسان کام نہ تھا، اور اس کے خیالات کی تردید صرف ایک ہی طرح ممکن تھی، اور وہ وجدان ہی کو پرکھنے اور آزمانے کا راستہ تھا، چنانچہ اقبال نے یہ راستہ اختیار کیا، انھون نے خود وجدان ذات کے حصول کی کوشش کی، تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ برگسان کے خیالات کی کہان تک تائید کی جاسکتی ہے حسن اتفاق سے جب اپنے من مین ڈوب کر اقبال کو وجدان ذات میسر ہوا تو ان پر منکشف ہوا کہ وجدان ذات سے صرف زور زندگی ہی کا انکشاف نہین ہوتا ہے، بلکہ زور خودی کا بھی پتہ چلتا ہے، برگسان اپنے وجدان ذات کے بعد صرف یہ کہہ سکا تھا کہ وجدان مین

"ذات نفس زور زندگی" سے متعلق معلوم ہوتی ہے، اقبال وجدان مین کسی قدر گہرے گئے، اور اُن کو درون ذات سے ایک انا کی آواز سنائی دی، انھین کچھ ایسا معلوم ہوا کہ "زور زندگی" خود ایک اور مصدر سے مشتق ہے، جس کو انھون نے زور خودی کے نام سے تعبیر کیا، وجدان ذات سے صرف یہی نہین معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مسلسل حرکت اور جنبش اور زور زندگی کی حامل ہے، بلکہ یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ "ذات نفس" زندہ جاوید ہے، خودی کی حامل ہے، اور اس طرح "قطعی آزاد" ہے،

اس نقطہ پر پہنچ کر اقبال نطشے کے خیالات سے اثر پذیر ہو کر اپنے فلسفہ خودی کی تعمیر مین مصروف ہو جاتے ہین،

اس سے پہلے کہ اُن کے فلسفہ خودی کی وضاحت کی جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نطشے کے نظریۂ خودی کو بیان کر دیا جائے، تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اقبال کس حد تک نطشے کے ہم خیال ہین، اور کہان سے اس سے الگ ہو جاتے ہین، اور وہ کونسی منزل ہے، جہان تک دونون ساتھ ساتھ چلتے ہین، اور جس کے آگے دونون کے لئے ایک دوسرے سے علٰحدگی لازم ہو جاتی ہے، اور اقبال نطشے کا ساتھ چھوڑ کر ایک بلند گ ہمسفر کے ساتھ جن کا نام پیر رومی ہے، اپنے مخصوص فلسفہ کی آخری منازل طے کرتے ہین[1] اکثر اصحاب کا یہ خیال ہے کہ اقبال پر سب سے گہرا اور سب سے پہلا اثر رومی کا پڑا ہے، اس مین شبہہ نہین کہ یہ اثر بہت گہرا ہے، لیکن اقبال کے مخصوص فلسفہ کی تعمیر مین اس اثر کو سب سے پہلے رکھنے کے بجائے سب سے آخر مین ضروری ہے اس مخصوص نکتہ کو اگلے مقالات مین تفصیل سے واضح کرنے کی کوشش کیجائے گی،

نطشے کا تمام فلسفہ شاپن ہار کے مخصوص خیالات کا رد عمل ہے، شوپن ہار نے عالم کائنات مین ایک ذوق وجود Will to exist کا اثبات کیا تھا، اُس کے نزدیک ہر ایک ذرۂ کائنات بقاے حیات کے لئے کوشان اور ہر شے سے ایک "ذوق حیات" نمایان ہے، اور اس حیات کو قائم

---

۱ اقبال اور رومی کا موازنہ اگلے مقالہ مین پیش کیا جائے گا،

رکھنے کے لئے بڑی جد و جہد اور محنت و مشقت کرنی ہوتی ہے، بہت سے خطرات اور مشکلات سے گذرنا ہوتا ہے، بہت سے معرکے جیتنے ہوتے ہیں، لیکن باوجود اس تمام جد و جہد کے کائنات میں حیات کا مقام مشتبہ ہی رہتا ہے، اور یقینی نہیں کہا جا سکتا، اس شکست اور سعیِ لاحاصل کو دیکھکر شاپن ہار نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ نظامِ کائنات ہی کچھ ہمت شکن اور حیات کُش واقع ہوا ہے، جس میں حیات کو قائم رکھنے کی جد و جہد برابر جاری رہتی ہے، لیکن حیات کو بمشکل برقرار رکھا جا سکتا ہے، ان مشاہدات اور خیالات کی بنا پر شاپن ہار نے عالم کی فطرت کو بہت ہی ظالم، بے پروا اور بے درد تصور کیا تھا، اور کہا تھا کہ کائنات میں کوئی ہمت افزا اور دلچسپ معنی مضمر نہیں ہیں، اور کائنات ایک اندھی طاقت کی حامل ہے، یہ طاقت انسان کے لئے بھی اسی قدر بے درد اور ظالم ہے، جس قدر دوسرے حیوانات اور نباتات کے لئے، اور موت اس قدر عام ہے کہ زندگی یا حیات کا قیام مشکل ہو سکتا ہے، حیات ایک عارضی، غیر مستقل اور ناپائدار نمایش ہے، یہ آج ہے کل نہ ہوگی، ان خیالات کی بنا پر شوپن ہار نے کائنات کی بہت ہی بھیانک تصویر کھینچی کہ کائنات میں چونکہ حیات کو برقرار رکھنا ایک دشوار امر ہے، اس لئے زندگی ایک بہت ہی غیر اعتباری اور دردناک حقیقت رکھتی ہے، اور وہ ہر لحظہ حوادثات و حالات و واقعات کے رحم و کرم پر ہے، زندگی غیر اعتباری اور غیر دوامی ہونے کے علاوہ نہایت ہی دردناک اور تکلیف دہ حقائق کی حامل ہے، مثلاً زندگی میں ہزارہا قسم کی ذہنی، فکری و روحی تکالیف مضمر ہیں، دوسرے الفاظ میں زندگی ایک مسلسل درد و الم کا نام ہے، جس میں نئی نئی تکالیف، نئی نئی فکریں ہر لحظہ ہمارے دل و دماغ پر مسلط رہتی ہیں، اور ان سے زندگی درد آگین اور غم آگین بنی رہتی ہے،

شاپن ہار نے گوتم بدھ کی طرح زندگی کو ایک دردناک حقیقت تصور کرتے ہوئے گوتم بدھ ہی کی طرح یہ سوال اٹھایا کہ ان تمام تکالیف، مصائب اور مشکلات سے مکتی، اور نجات کا آخر کوئی ذریعہ ہے یا نہیں، اگر ہے تو کیا ہے، اور گوتم بدھ ہی کی طرح شاپن ہار نے یہ محسوس کیا کہ زندگی محض اس لئے اس قدر

دکھی اور تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے کہ ہماری خواہشات اور آرزوئیں جو لحظہ بہ لحظہ ادلتی بدلتی رہتی ہیں، سب بیک وقت پوری نہیں ہو سکتیں، اور بعض خواہشات دوسری خواہشات کے قربان کرنے سے ہی پوری ہو سکتی ہیں، اس طرح ہر کامیابی میں کچھ نہ کچھ ناکامی ضرور مضمر رہتی ہے، بعض خواہشات ایسی ہیں جو حاصل ہو جانے کے بعد دوسری خواہشات کا موجب بن جاتی ہیں، اور وہ اطمینان اور سکون اور طمانیتِ قلب جو حصولِ مراد کے بعد میسر ہونا چاہئے تھا، میسر نہیں ہوتا، بعض خواہشات ایسی بھی ہیں جن کا پورا کرنا بعید و دشوار ہے، اُن کے حاصل کرنے میں اس قدر تکالیف اور مصائب اٹھانے پڑتے ہیں، کہ ان کے حصول کے بعد پھر کوئی لذت یا خوشی ہی میسر نہیں ہوتی، اور حصولِ مراد کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سودا بہت مہنگا رہا،

شاپن ہار نے خواہشات کی اس اصلیت کو سمجھنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ زندگی کو المناک اور درد آگین بنانے میں سب سے بڑا ہاتھ خواہشات اور تمناؤں کا ہے، اگر انسان خواہشات، طلب اور جستجو سے اپنے کو بے نیاز کرلے، تو پھر اُس کی زندگی دردناک اور ناکامیاب نہ ہو سکے گی، اس لئے اُس نے سب سے زیادہ زور اس پر دیا کہ انسان کو خواہشات کی نفی کرنی چاہئے، ایسا کرنے سے ہی زندگی سے غم اور الم کا پہلو کسی قدر کم ہو سکے گا، مختصر یہ ہے کہ

۱- شاپن ہار کو نظامِ کائنات میں کوئی امید افزا پہلو نظر نہیں آیا،

۲- نظامِ کائنات اس کے عقیدہ کی رو سے انسان کے ہر پاک حوصلہ اور بلند مقصد کی نفی کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے،

۳- نظامِ عالم بیحد بے دردانہ طریقے پر انسان کی مخالفت اور مخاصمت کے درپے ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کو ہمیشہ شکست ہی ہوتی ہے، اور اس شکست، ناکامیابی اور نامرادی سے اس پر قنوطیت طاری ہوتی ہے،

۴- چونکہ نظامِ کائنات ہمارے حوصلوں، ہماری تمناؤں، اور آرزوؤں، ہمارے ذوق و شوق،

(ناتمام)

ہماری طلب اور جستجو کے منافی ہے، اس لئے سب سے بہتر شکل یہ ہے کہ سرے سے تمناؤن، آرزوؤن، طلب اور جستجو، ذوق اور شوق اور حوصلون کی ہی نفی کر دی جائے، یعنی ذاتِ شخص کی نفی کرنے سے ہی ذات شخص کو کامیابی میسر ہو سکتی ہے،

نطشے اس معاملہ مین ضرور شاپن ہار کا ہم خیال ہے کہ نظام عالم بے درد ہے، ظالم ہے، ایک ایسی اندھی طاقت کا حامل ہے، جس کو انسانی حوصلون اور تمناؤن سے کوئی ہمدردی نہین لیکن اس بنا پر انسان کو اپنی جد وجہد اور حوصلون کو ختم کر دینا یا اُن کو ختم کر دینے کی کوشش کرنا یا دوسرے الفاظ مین ہار مان لینا، نامراد، ناکامیاب، اور غم آگین، اور ماتم زدہ بن کر بیٹھ جانا انسانیت کی توہین ہے، ہر انسان کو بہر حال مشکلات، ناممکنات، اور مصائب پر فتح پانی ہے، جس کے لئے جد وجہد ضروری ہے، بلکہ جد وجہد ہی زندگی ہے، جد وجہد ہی کرتے رہنا عین کامیابی ہی، حرکت مین برکت ہی، حوصلے بلند رکھنا ضروری ہین، آرزوؤن اور حوصلون کا پورا ہونا اس قدر دلچسپ اور روح افزا نہین جس قدر اُن کے لئے تڑپتے رہنا دلکش اور زندگی کو زندہ تر اور تابناک تر کرنے والا ہے، اور بالآخر فتح اور کامیابی انسان ہی کی ہو گی، مشکلات سے گھبرانا نہین چاہئے کیونکہ نتیجہ بہر حال دل افروز ہوگا، اگر ہم مشکلات اور مصائب سے پامال ہو کر مر بھی جائین تب بھی حوصلون کو پورا کرنے کی جد وجہد مین مر جانا بھی ایک طرح کی کامیابی اور فتح ہے، اور ہزار ہا نکمے، اور پست حوصلہ اور کم ہمت لوگون کی موت بھی ایک بڑی کامیابی اور فتح کا اعلان ہے، یہ مافوق البشر انسان کی آمد کا پیش خیمہ ہے، اور اسی طرح ایک ایسا عظیم الشخصیت انسان پیدا ہو سکے گا، جو عالم کے تمام مصائب پر حاوی ہو جائیگا، اس کی تمام بے درد اور ظالم قوتون سے بڑھکر بے درد اور ظالم ہوگا، جو عالم کے مصائب کا ہنس ہنس کر مقابلہ کرے گا جس مین اتنی قہاری اور جباری ہو گی کہ اگر دنیا اس کی مرضی پر نہ چلے گی، تو وہ دنیا کو ہی پاش پاش کر دیگا، ایسا شخص ہماری طرح ابن الوقت ہونے کے بجائے ابو الوقت ہوگا، وہ کسی کہنہ روایت اور حکایت یا رسم و رواج کا پابند نہ ہوگا، جو کچھ وہ پسند فرمائے گا، وہی خوب کہلائیگا'

جس چیز کو وہ بُرا تصور کریگا، وہی عرف عام مین بری اور ناخوب کہی جائے گی، اس مین خودی کا ظہور اس قدر شدید ہوگا، کہ اپنے علاوہ کسی اور کو نہین دیکھے گا، جو کچھ اس کو پسند ہوگا وہی سارے عالم کو پسند کرنا لازم ہوگا، تمام عالم مین وہی شخص ایسا ہوگا، جو صحیح معنی مین آزاد عالم ہوگا، حاکم ہوگا، اور زندگی کے تمام نظریات اور اس کی تمام روایات اور رسومات کا وہی خالق ہوگا، اگرچہ علم و فلسفہ مذہب اور سیاست اسی کی قوت تخلیق کے مرہونِ منت ہون گے، یہ بلند منظر آج انسان کے ہزارون سال کے فاصلہ پر معلوم ہوتا ہے، مگر ایک دن ضرور حاصل ہوگا، امید رکھنا اور کوشش کرتے رہنا یہی کامیابی کا راز ہے، دور کی منزل ہے، اور موجودہ مشکلات سے گھبرانا کوئی معنی نہین رکھتا، جب کامیابی ہماری ہے، تو پھر شاپن ہار کا خوف وحزن بے معنی ہے، اور اس کی قنوطیت نوعِ انسان کی توہین ہے، ایسا شخص جو اس قسم کی قنوطیت کی تبلیغ کرے، اور خوف وحزن اور ملال ہی مین اپنی زندگی گذارے گردن زدنی ہے زندہ رہنے کے قابل نہین، اگر مافوق البشر انسان آج موجود ہوتا تو ایسے قنوطیت پسند اور کمزور انسان اس کے حکم سے یکسر ختم کر دیئے جاتے،

حاصل کلام یہ ہے کہ نطشے نے شوپن ہار کے فلسفۂ قنوطیت کی تردید مین انسانی خودی پر غیر معمولی زور دیا ہے، اس کے نزدیک خودی کا اصلی مفہوم اولاً یہ ہے کہ انسان اپنی توانائی اور طاقت مین اس قدر محو ہو جائے کہ اپنے علاوہ کسی کو نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھے، بلکہ غیر اسکو نظر ہی نہ آئے، خودی کا یہ منفی پہلو ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان قلب کی گہرائیون مین یہ محسوس کرے کہ سوا میرے وجود کے اور کوئی شے یا شخص موجود نہین ہے، اور اس کا اثباتی پہلو یہ ہے کہ اس کو یہ اذعان و یقین ہو کہ میری ذات دو مخصوص خصوصیات یعنی جباری و قہاری کی حامل ہے، ان دونون صلاحیتون کو انتہائی فروغ دیا جائے اور نرم و نازک انسانی جذبات و احساسات سے ماورا ایک جابرانہ حاکمانہ اور آزادانہ زندگی بسر کی جائے اس طرح عالم کائنات پر قابو پایا جا سکتا ہے، اور زندگی کی مشکلات، مہمات، صعوبات پر فتح پائی جا سکتی ہے، یہ خوش نمائی خود پرستی

خود نگاہی، خود بینی، خودی، میری ہی نہیں بلکہ ہر ذرۂ کائنات کی فطرت ہے، اسی لئے ایک قسم کا تنازع
اور جھگڑا ہر لحظہ وقوع پذیر ہے، کیونکہ میری خواہشات اور میرے حوصلے ہر لحظہ دوسروں کی خواہشات
اون کے حوصلوں سے ٹکرا رہے ہیں، شاپن ہار نے اس کا علاج یہ تجویز کیا تھا کہ جب میں اپنے ارادوں
حوصلوں اور اپنے خواہشات سے دست بردار ہو جاؤں گا تو مجھ کو اطمینان ہوگا، اور کامیابی میسر
ہو سکے گی، نیطشے کے نزدیک یہ توہین آمیز اور انسانیت سوز حرکت ہوگی، ایک ناقابلِ معافی جرم ہوگا،
یہ کوئی علاج نہیں، اس کا صحیح علاج یہی ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے کو اس قدر توانا اور طاقتور بنالیں کہ بآسانی
دوسروں پر فتح پا سکیں، اور اپنے کو اس قدر مضبوط کر لیں کہ جو چاہیں وہ کر سکیں، جو خواہش کریں، اس کو
پورا کر سکیں، اگر خودی مضبوط ہو گئی، تو فتح ہر جگہ ہماری ہوگی، ہمارے اشاروں پر دنیا کو چلنا ہوگا،
دنیا ہمارے خیالات اور ہماری خواہشات کے تابع ہوگی، ہم کسی طرح بھی محکوم نہ ہونگے، (باقی)

نوائے حیات

(از جناب یحییٰ اعظمی)

جناب یحییٰ اعظمی کا مجموعۂ کلام نوائے حیات جس سے ناظرین معارف اور دوسرے اصحاب
ذوق پوری طرح واقف ہیں، وہ دوبارہ چھپ گیا ہے، اس اڈیشن میں بہت سی نئی غزلوں اور
نظموں کا اضافہ ہے، اور اب یہ مجموعہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہو گیا ہے، اس کے شروع میں
مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم فیض رقم سے ایک مبصرانہ مقدمہ ہے،

قیمت مجلد عہ غیر مجلد ۱۲؍

"منیجر"

حضرت شاہ برہان الدین رازِ الٰہی

از

جناب بشیر محمد خان صاحب برہان پوری ایم اے ال ال بی (علیگ)

(۲)

عبادت و ریاضت

حضرت راز الٰہی بڑے عابد و زاہد و مرتاض تھے، آپکے شبانہ یوم کا بڑا حصہ عبادت و ریاضت میں
گذرتا تھا، آپکے معمولہ اوراد و وظائف یہ تھے، سو مرتبہ روزانہ یا حی یا قیوم لا الہ الا انت سبحانک انی کنت
من الظالمین پڑھتے، اور پانسو تین تسبیحیں پانچوں نمازوں کے بعد، دعائے سیفی حزب البحر اور چہل اسم و مسبعات
عشر روزانہ پڑھتے تھے، روزانہ وضو سے فارغ ہونے کے بعد انا انزلنا پڑھتے تھے، اور فجر کی سنت میں پہلی رکعت
میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ کافرون اور دوسری میں سورۂ اخلاص پڑھتے تھے، اور سنت فجر کے بعد سبحان
اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم وبحمدہ استغفر اللہ ربی من کل ذنب واتوب الیہ
سو بار پڑھتے تھے، اور آخر عمر میں تین بار سبحان اللہ وبحمدہ پڑھتے تھے، اور فجر و مغرب کی نماز کے بعد استغفر اللہ
الذی لا الہ الا ھو الحی القیوم واتوب الیہ تین مرتبہ اور اللھم انت السلام ومنک السلام
والیک یرجع السلام حینا ربنا بالسلام تبارکت ربنا وتعالیت یا ذا الجلال والاکرام
اللھم لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت ولا راد لما قضیت ولا ینفع ذا الجد
منک الجد" ایک بار پڑھتے تھے، اس کے بعد لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ، لہ الملک

وَلَہُ الحمدُ یحیی و یُمیت وَھُوَ حَیّ لایموت بیدہِ الخیر وَھوَ الخیر وھو علیٰ کُلِّ شیئٍ قدیرٌ دس بار بطریق حلقہ وضرب پڑھتے تھے، اور گیارہوین مرتبہ اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریکَ لَہٗ واشھدُ انّ محمّداً عبدہٗ ورسولہ وان عیسیٰ عبد اللّٰہ ورسولہ وابن امتہ وکلمتہ القیھا الی مریم وروح منہ وان الجنۃ حق والنار حق والصراط حق والبعث حق والمیزان حق والشفاعۃ حق والذنوب حق واللقاء حق ایک بار پڑھتے تھے، اس کے بعد ہاتھ اٹھاکر درود پڑھتے تھے، اور یا ارحم الراحمین تین بار کہتے، اور اللّٰھم اغفر للمؤمنین والمؤمنات ۲۷ بار پڑھ کر منہ پر ہاتھ پھیرتے اور کلمہ طیب تین بار بطریق حلقہ پڑھتے، اور دونون ہاتھ کی انگلیون کو ہر بار حرکت دیتے تھے،

روزانہ باری تعالیٰ کے ۹۹ نامون کا ورد کرتے اور دو یا چار دوگانہ اشراق گذارتے، دو کھڑے رہ کر اور دو بیٹھ کر پڑھتے، اور کبھی کبھی زیادہ بھی پڑھتے تھے، نماز ظہر مین چار سُنّت، چار فرض، دو سُنّت، اور دو نفل پڑھتے، اور دو دوگانہ بیٹھ کر پڑھتے، اس کے بعد تسبیح یعنی کلمہ سبحان اللہ ۳۳ بار الحمد للہ ۳۳ بار اور اللہ اکبر ۳۳ بار اور آخر مین ایک بار لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہٗ لہُ الملک ولہُ الحمدُ وھو علیٰ کل شیئٍ قدیرٌ" پڑھتے تھے، اور آخر مین کلمہ اللہ اکبر سو بار پورا کرتے[1]

ہر نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھا کرتے تھے، اور عصر کے وقت کبھی کبھی چار رکعت سنت پڑھتے تھے،

فریضہ مغرب کے بعد دوبارہ کلمۂ مذکور بالا ترتیب سے پڑھتے تھے، پھر دو رکعت نماز سنت ادا کرنے کے بعد دو نفل پڑھتے تھے، فاتحہ اول کے بعد سورۂ انعام الحمدُ للّٰہ الذی خلق السّمٰوٰت والارض تاما کانوا بہ یستھزءون،

اس کے بعد چار رکعت نماز قلاقل پڑھتے، اور ہر رکعت مین سورۂ فاتحہ کے بعد چار قل اور ایک سلام

---

[1] ملفوظات محمد یوسف،

کے بعد سجدہ مین ۲، یا ۳، بار یا حیُّ یا قیّوم برحمتک استغیث پڑھا کرتے، فرماتے تھے کہ وسعتِ رزق کے لئے ہر نماز کے بعد پانچ مرتبہ آیۂ کریمہ:- ومن یتق اللہ ...... آخر تک پڑھنا مفید ہے،

تصانیف | آپ کو تمام علوم متداولہ خصوصاً علم فقہ وحدیث مین کامل دستگاہ حاصل تھی، صاحبِ تصنیف تھے، آپنے کئی کتابین تصنیف کین، اُن مین بعض مشہور کتابون کا ذکر کیا جاتا ہے،

شرح آمنت باللہ:- یہ ۴۵ صفحہ کی چھوٹی سی کتاب ہے، اس مین آمنت باللہ کی عام فہم اور نکات سے لبریز تشریح ہے،

وصیّت نامہ:- یہ کتاب بھی ۴۰ صفحہ کی فارسی مین اذکار واشغال پر ہے، اور اس مین طالبِ دنیا کی مذمت اور محبت کا بھی ذکر ہے، پہلی وصیت یہ ہے کہ ایک دیکھتا ہے، اور سمجھتا ہے، دوسرا سمجھتا ہے، اور کہتا ہے، اسی طرح ایک ڈھونڈتا ہے، اور جو کچھ دیکھتا ہے، اسی سے دیکھتا اور جانتا ہے، ھُوَ الاوّل ھُوَ الآخر ھُوَ الظّاھِر ھُوَ الباطن"، دوسری وصیت یہ ہے کہ اپنی خواہش دور کرکے اپنے کو خدا کے سپرد کر دو، بیت:-

طلب آفت دارادت وبال
وجودت حجابست وجود آن محال

تمنائے قرب وخیالِ حضور
غروریست نفسانی اے دور دور

دنیا کی خدمت کے بارے مین فرماتے ہین،

ہر چیز جز حق بسوز وغارت کن
ہر چہ جز دین ازو طہارت کن

ہم خدا خواہی وہم دنیائے دون
این خیال ست ومحالست وجنون

تیسری وصیت:- طالب عقبیٰ کے بیان مین ہے، چوتھی وصیت طالبانِ حق کی صفت مین ہے، فرمایا جو کوئی اسم "اللہ" بارہ ہزار مرتبہ بارہ روز تک پڑھے اس کو باطنی روزی کی فتح ہوگی، اور حق کا مشاہدہ ہوگا، اگر آدھی رات کے وقت پڑھے تو بہتر ہے، پھر فرمایا کہ اے برادر جو عمل وعبادت یا جو کام

کیا جائے تو پہلے نیت درست ہونی چاہئے، اس مین دنیا و عقبیٰ کی غرض کا شائبہ بھی نہ ہو یعنی خالصاً للہ اور خدا
کو راضی رکھنے کے لئے کیجائے، اور یہ نیت کرے کہ یہ عمل حق سبحانہ و تعالیٰ کو پسند آئے،[1]

اقوال و ملفوظات آخر مین آپ کے کچھ اقوال و ارشادات درج کئے جاتے ہین:-

"فرمایا کہ جو خدا تک پہونچائے وہ دین ہے، اور جو خدا سے باز رکھے، وہ دنیا ہے،

"فرمایا کہ سلطان ابوسعید ابوالخیر فرماتے تھے کہ ایک دسترخوان پر اور ایک طبق مین
ل کر کھانا سنت ہے، اور باعث برکت بھی،

"فرمایا کہ جہان ادب نہین وہان فیض نہین، ہر کام مین خدا کی مدد ڈھونڈھو،

فرمایا کہ جمعہ اور جماعت مین بڑا ثواب ہے، جماعت کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس مین
قوت اسلام ہے، دوسرے جمال دین اور تیسرے کافرون اور ملحدون پر رعب ڈالنا،"[2]

فرمایا کہ جمعہ و عیدین اور حرمین الشریفین مین مسلمانون کے اجتماع اور آپس مین مصافحہ
کرنے مین یہ حکمت ہے کہ ازل مین تمام ارواح اکٹھا تھین، اور ابد مین پھر ایک جگہ جمع ہونگی
اس لئے ازل اور ابد کے درمیانی اوقات مین مجتمع ہو کر اتحاد ازلی اور ابدی کو یاد کرین،
مصافحہ کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ مومنون مین جو مغفور ہے، اس سے مصافحہ کرنے سے دوسرا
شخص بھی مغفور ہو جاتا ہے،

جب مومنون کے ساتھ بیٹھو تو عمر مین جو تم سے چھوٹا ہو اس کے متعلق یہ گمان کرو کہ اس
کے نامۂ اعمال مین گناہ کم لکھے گئے ہین، اور اسی مطابق اس سے پیش آؤ، اور جو تم سے
عمر مین بڑا ہو اس کے متعلق سمجھو کہ وہ معرفت اور عرفانِ الٰہی مین تم سے زیادہ ہے،
اس کے مطابق اس سے سلوک کرو،

[1] ثمرات الحیات از عاقل خان رازی [2] ملفوظات علم اللہ کلام،

برادر دینی سے ملاقات کرنا جو ہر عبادت ہے مگر چند باتین نگاہ مین رکھے، مکر و ریا سے نہ پیش آئے غیبت
نہ کرے، اور کبھی کبھی ملاقات کو جایا کرے،

ہمہ صفت موصوف وہ جوانمرد ہے جس مین سخاوت، شفقت، دنیا سے بے نیازی، اور حق سے
نیازمندی ہو،

فرمایا کہ از دیاد ثواب کی نیت سے جماعت کی پہلی صف مین بیٹھنا اہلِ شریعت کے مذہب کے مطابق
ہے، اور آخر مین صف مین بیٹھنا تاکہ دوسرے مومنون کو ثواب زیادہ ملے، اہلِ فقراء کے مذہب کے
مطابق ہے،

فرمایا، خاموشی گفتگو سے بہتر ہے، لیکن کلامِ نافع خاموشی سے بہتر، خلوت جاہلون، اور غافلون
کی صحبت سے انسب ہے، لیکن عالمِ دین، اور درویش صاحبِ تمکین کی صحبت خلوت سے افضل ہے:-

جس طرح طالبِ حق کے لئے لازم ہے کہ خود کو مرشدِ کامل کی خدمت مین ملازم سمجھے، اسی طرح
مرشدِ کامل پر واجب ہے کہ وہ طالبِ صادق کی تربیت مین پورے التفات سے کام لے، اور اس کو
خدا کی امانت پہنچا دے،[1]

گوشہ نشینی کا حق یہ ہے کہ جسم لوگون کے ساتھ اور دل خدائے تعالیٰ کے ساتھ ہے، اگر کوئی ملاقات
کے لئے آئے تو اُس کا شکریہ ادا کرے، اور اگر روگردانی کرتا ہے، تو اس کو فراغتِ دل کے لئے غنیمت سمجھے

فرمایا کہ اگر سالک تارک الدنیا ہو جانے کے بعد بھی مقصد کو نہین پہنچتا ہے، تو اس کو چاہئے کہ دل
تنگ نہ ہو، اس کا حال اس مکھی کے جیسا ہے جو نجاست سے اُٹھ کر پرواز کرتی ہے اگرچہ وہ آسمان
تک نہین پہنچتی، مگر غلاظت سے تو دور ہو جاتی ہے،

فرمایا کہ والدین کے حقوق اولاد کے ذمہ اس حد تک ہین کہ اگر ماں یا باپ مین سے کوئی ایک کافر ہو

[1] ملفوظات حضرت شاہ برہان از علم اللہ کمال،

اور فرزند کو حکم دے، کہ ان کے لئے ستور کا گوشت لے آ، تو اُس کو لے آنا چاہئے، اگر پکانے کا حکم دے تو پکا کر اس کے سامنے پیش کر دے، لیکن اگر کھانے کے لئے کہے تو انکار کر دینا چاہئے، کیونکہ اس صورت مین ماں اور باپ کی نافرمانی حکم خداوندی کے مطابق ہے،

فرمایا کہ پڑوسیون کے حقوق مین بھی فضیلت ہے، وہ تین قسم کے ہین، اگر ہمسایہ کافر ہے تو وہ صرف ایک حق رکھتا ہے، اور وہ حقِ ہمسایگی ہے، اور اگر ہمسایہ مسلمان ہے، تو وہ دو حق رکھتا ہے، ایک حق ہمسایگی، دوسرا حقِ اسلام، اور اگر ہمسایہ مسلمان ہونے کے علاوہ رشتہ دار بھی ہے تو وہ تین حق رکھتا ہے، حقِ ہمسایگی، حقِ اسلام، اور حقِ قرابت،

فرمایا کہ اہلِ دنیا معاش کے معاملہ مین تین قسم کے ہین، ایک وہ جو عطیۂ الٰہی کو دنیا سے چھپاتے ہین اور اپنی غربت کا اظہار کرتے ہین، یہ لوگ منافق ہوتے ہین،

دوسرے وہ کہ جن کو جتنا اسبابِ دنیوی حاصل ہے، اسی پر قناعت کرکے اُس کو ظاہر کرتے ہین، وہ موافق ہوتے ہین،

تیسرے وہ کہ جن کی زندگی فقر و فاقہ مین گذرتی ہے، مگر اُس کی پردہ پوشی کرتے ہین[1]، یہ سب برتر اور فائق ہوتے ہین،

جو حق کو دیکھتا ہے، مگر خلق کو نہین دیکھتا، وہ مجذوب ہے، وہ کسی کی ہدایت نہین کر سکتا، جو خلق کو دیکھتا ہے، اور حق کو نہین دیکھتا، وہ محجوب ہے، وہ بھی کسی کی رہنمائی نہین کر سکتا، جو خلق کو دیکھنے کے ساتھ حق کو دیکھتا ہے، وہ عارف ہے، اور وہی اقتدا کرنے والون اور محجوبون کا دیدۂ توحید کشادہ کرتا ہے، اور ذاتِ واحد کو کثرت مین دکھلاتا ہے،

فرمایا درویشی آٹھ صفتون پر منحصر ہے، (۱) کم کھانا (۲) کم سونا (۳) کم بولنا، (۴) اہلِ دنیا کے ساتھ

[1] ملفوظات از علم اللہ کمال، ثمرات الحیات از عاقل خان رازی،

کم رہنا (۵) ہمیشہ روزہ رکھنا (۶) ہمیشہ باطہارت رہنا، (۷) ذکرِ الٰہی مین مشغول رہنا، (۸) مرشد کی طرف قلب کو رجوع رکھنا،

جس شخص مین یہ صفتین موجود ہون اگرچہ وہ بظاہر دنیادار ہو، مگر محمود ہے، اور جس شخص مین یہ صفتین معدوم ہون اگرچہ وہ بظاہر فقیر ہو، مگر فقر کے ثمرہ سے محروم ہے،

فرمایا کہ بعض مشائخ کی اولاد مین اپنے والد کی زندگی مین مرتبۂ کمال کو نہ پہنچ سکین اور بعد مین بھی انھون نے اپنے کو کسی مرشد سے متعلق نہین کیا، بلکہ اپنے آبا و اجداد کی قبرون کی طرف متوجہ ہو گئے، اور ارشاد و ہدایت کے منتظر رہے، یہ غلط طریقہ ہے، طالبون اور مریدون کی تربیت اور اُن کی ظاہری و باطنی توجہ کے لئے مرشد کا حاضر و قائم ہونا ضروری ہے،

پھر فرمایا کہ اگر قبرون ہی سے فائدہ اور ارشاد حاصل کرنا جائز اور فائدہ مند ہوتا، تو پھر کسی شخص کو کسی پیر سے مرید ہونے کی ضرورت نہ پیش آتی، اور تمام طالبانِ حق مدینہ منورہ کی طرف متوجہ ہو کر حضرت رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے مرقد منورہ اور روضۂ مطہرہ کی طرف توجہ کرتے، اور اس آستان قدسی کے فیض سے اپنے مطلب کو پہنچ جاتے[1]،

فرمایا کہ جب تک کوئی شخص صدق و خلوص سے کام نہ لے، دین حاصل نہین ہوتا، اور اسی طرح جب تک جھوٹ اور فریب سے کام نہ لے، دنیا حاصل نہین ہوتی، یعنی دونون ایک دوسرے کی ضد ہین،

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دون   این خیال ست و محالت و جنون

فرمایا کہ مشائخ مین سے بعض ایسے بھی ہوتے ہین جن کی مشیخت کی شہرت شرق سے غرب تک تمام روئے زمین پر ہوتی ہے لیکن خدائے تعالیٰ کے نزدیک اُن کی قدر و منزلت پشہ کے پر کے برابر بھی نہین ہوتی، یعنی قبولیت خلق سے قبولیت حق کا ہونا لازمی نہین ہے، بلکہ ردِ خلق قبولیتِ حق کا باعث

[1] ثمرات الحیات از عاقل خان رازی، ملفوظات علم اللہ کلام،

ہوتی ہے، بعض مردود الخلق مقبول الحق ہوتے ہیں، دوسرا فائدہ یہ ہے کہ قبولیت خلق مستلزم شہرت جو موجب آفت

ہے، اور رد خلق میں راحت و سلامتی ہے:-

نیک باشی و بدت گویند خلق

بہ کہ بد باشی و نیکت دانند

فرمایا کہ طلوع آفتاب کے وقت اگر آئینہ کو اُس کے مقابل میں رکھا جائے تو آئینہ بھی نظر آتا ہے، اور آفتاب بھی، یہ مثال مبتدی کی ہے، اور نصف النہار کے وقت آفتاب نظر آتا ہے، مگر آئینہ نہیں نظر آتا، یہ مثال متوسط کی ہے، اور غروب آفتاب کے وقت آئینہ بھی نظر آتا ہے، اور آفتاب بھی، جیسا کہ طلوع آفتاب کے وقت نظر آتا ہے، یہ مثال عارف منتہی کی ہے،

چنانچہ حضرت شاہ ابراہیم بھکری کا ایک معاملہ بتلایا کہ ایک روز ایک فیل مست چھوٹ گیا، اور بازار میں بھاگتا ہوا آیا، حضرت شاہ ابراہیم اس کو دیکھ کر افتان و خیزان ایک دوکان پر چڑھ گئے، لیکن اُن کا خادم اطمینان کے ساتھ دوکان کے نیچے کھڑا رہا، اور عرض کیا کہ ہنوز ہاتھی دور ہے، شاہ ابراہیم نے فرمایا بابا تو نہیں جانتا وہ بہت نزدیک ہے، اس کلام کا حاصل یہ ہے کہ وہ مرتبہ متوسط کا تھا، اور یہ منتہی کا، یعنی یہ فرار و اضطرار اس تسکین و قرار سے بدرجہا بالاتر ہے،[1]

فرمایا کہ خدا سے ایسی التجا نہیں کرنا چاہئے کہ خداوندا میری نعمت دنیوی مجھ سے سلب کرلے اور میری آخرت معمور کر بلکہ یہ مناجات کرنا چاہئے کہ الٰہی مجھے دین و دنیا دونوں عطا کر، کیونکہ خدائے تعالیٰ قادر ہے، وہ دونوں کو ایک جگہ جمع کر سکتا ہے، اگرچہ دونوں کا اجتماع دشوار ہے مگر ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار قرآنی دعا ہے، پھر فرمایا کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ اگر دین و دنیا ایک جگہ جمع ہو سکتے تو دونوں کا مرتبہ مجھے حاصل ہوتا، کیونکہ قوت باطنی مجھ میں

---

[1] ملفوظات حضرت شاہ برہان الدین راز الٰہی از محمد یوسف ولد محمد فاہر،

بہت ہے، لیکن میں نے دیکھا کہ دونوں جمع نہیں ہو سکتے کہ وہ ایک دوسرے کی ضد ہیں،

فرمایا کہ تین شخص عموماً استفادہ پیر سے بے بہرہ رہتے ہیں، اول فرزند، دوسرے بیوی، تیسرے خادم جو مقرب ہو، اسی طرح فیض شیخ سے تین شخص محروم رہتے ہیں، ایک طالب دنیا کہ ناجنس ہوتا ہے، دوسرا حاسد کہ الحسد یاکل الحسنات کما تاکل النار الحطب، تیسرے غبی کہ اس کو پیر کی مرضی بالکل معلوم نہیں ہوتی،

فرمایا کہ حدیث میں وارد ہے کہ پانچ قسم کے لوگوں کو خدائے تعالیٰ قیامت کے روز دوزخ میں بھیجنے کا حکم دیگا، اول اُن علماء کو جنھوں نے دنیا، جاہ اور قربت سلاطین کے حصول کے لئے علم حاصل کیا، دوسرے وہ قرآن خوان جنھوں نے حصول جاہ و شہرت کے لئے قرأت حاصل کی، تیسرے اسی قسم کے زہاد و عباد، چوتھے ارباب سخا کو، پانچویں اصحاب شجاعت کو، کیونکہ ان لوگوں کا مقصد دنیوی حصول شہرت تھا،[1] پھر فرمایا کہ اگر مسلمانوں کی ترغیب و تحریص کے لئے ریا اختیار کرے تو مضر نہیں ہے،

فرمایا کہ بعض لوگ حج کو جانے کے لئے امراء و سلاطین کے سامنے دست سوال دراز کرتے ہیں، حالانکہ ان پر حج فرض نہیں ہے اور وہ اس کام کے لئے جو ان پر فرض نہیں ہے، مرتکب حرام ہوتے ہیں یعنی سوال کرنا،

فرمایا کہ فقیر کے پدر بزرگوار نے جد بزرگوار سے پوچھا کہ بابا ہم کس قوم سے ہیں، فرمایا عرب، پھر پوچھا کہ عرب میں اصیل بھی ہیں، اور رذیل بھی، ان دونوں میں سے ہمارا تعلق کس سے ہے، فرمایا کہ تم اپنے عمل سے سب کچھ ہو سکتے ہو، اگر تمھارے عمل شائستہ ہیں، اور لوگوں سے حسن معاملت رکھتے ہو، تو نجیب اصیل ہو، ورنہ رذیل،

فرمایا کہ حضرت مسیح الاولیاء صبح کی فرض نماز ادا کرنے کے بعد اللّٰھم اغفر لی وللمومنین و المومنات ہمیشہ پڑھا کرتے تھے، اور فقیر بھی اس وظیفہ کو ہمیشہ پڑھتا ہے اس لئے ہر نمازی کو چاہئے

---

[1] معارف :- اس سے مراد وہ زہاد عابد فیاض و سخی اور اصحاب شجاعت ہیں، جنھوں نے حصول شہرت کے لئے یہ اوصاف اختیار کئے ہوں یہ پوری حدیث ترمذی ابواب الزہد میں ہے،

کہ فجر کی فرض نماز کے بعد یا ہر اُس نماز کے بعد جس کو وہ مقرر کرے، یہ وظیفہ ۲۵ یا ۲۰ مرتبہ روزانہ پڑھا کرے تو حق تعالے اُس کو اُن اولیاء کے زمرہ مین شمار کرے گا، جن کی برکت سے اہلِ زمین کو رزق پہنچتا ہے،

فرمایا کہ جو شخص سورۂ فاتحہ تیس مرتبہ رات کے وقت غرہ ماہ سے اس مہینہ کی پانچ تاریخ تک اوقاتِ معینہ مین پڑھ لیا کرے تو وہ پورا مہینہ خیر و عافیت سے گذرے گا، اسی طرح غرہ ماہ کی شب مین انا فتحنا کی سورت پڑھنا چاہیئے، فرمایا کہ اگر روزِ عاشورہ ستر مرتبہ کلمہ حسبنا اللہ نعم المولیٰ نعم النصیر پڑھا جائے، تو بے حساب ثواب ملتا ہے،

فرمایا جو شخص یا حی یا قیوم لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین ہمیشہ پڑھتا رہے، اور روزانہ ۲۰۰ مرتبہ یا جس قدر ہو سکے پڑھا کرے، تو اس کو دین و دنیا دونون کی مرادین حاصل ہون گی کیونکہ تمام موجودات کا قیام ان ہی دو بنیادون یا حیّ یا قیوم کی تجلیات پر ہے، اور اس کے اثرات دو قسم کے ہین، روحانی اور جسمانی، روحانیت کی زندگی اسم حیّ کی تاثیر سے ہے، اور جسمانیات کا قیام اسم قیوم کا نتیجہ ہے، چنانچہ جب کوئی ان دونون نامون سے خدا کو یاد کرتا ہے، تو گویا وہ تمام روحانی اور جسمانی موجودات تسبیح کرتا ہے،

شاعری حضرت برہان الدین رازِ الٰہی شاعر بھی تھے، اور فنِ عروض اپنے مرشد سے حاصل کیا تھا، آپ اکثر اوقات حالتِ وجد مین شعر کہتے تھے، آپ کا سب سے پہلا شعر یہ ہے،

ہر نماز کہ ترا گویم بشنو اے جانِ پدر   در خود نگر آن وجہ مطلق تا نگردی در بدر

آپ کا کلام صوفیانہ رنگ مین ڈوبا ہوا ہے، مگر افسوس اب وہ دستیاب نہین ہوتا، البتہ آپ کی مثنوی کا قلمی نسخہ کتب خانہ پیر محمد شاہ احمد آباد مین موجود ہے، اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے،

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی سیما علی سیدنا المصطفے وعلی صحبہ اجمعین بیان تنزلِ حق جل علی بعقائد صوفیہ قدس تعالیٰ ارواحہم اجمعین،

ذاتِ حق چون بود اوّل بے نشان
نے تعین داشت و نے نام و نشان
از ظہور و از بطون و از صفات
او مبرا بود و از جملہ جہات

چند اشعار کے بعد دوسرا قطعہ اس طرح شروع ہوتا ہے،

گشت حاضر در کمالِ خویشتن   آنچہ اول بود و آخر ذو المنن
عاشق آمد در کمالِ خویشتن   خواست تا بود وصالِ خویشتن
فیض بخشد خستہ درویش را   تا بدست آرد دلِ درویش را
وحدتے ظاہر شدہ اجمال وا   تا لِ تفصیل بود است وشمار
جملہ شانہائے وجود خویش دید   غیر او اندر میان نا پدید
این حقیقت شد شہِ کونین را   زو رسد ہر فیض بر ہر دو سرا
ہست اینہا ان ہیئت خیر جہان   قاب قوسین است ایمائے ازان
ملک او ادنی اشارت زان بود   نزد اہلِ حق حقیقت آن بود
وحدتش را دو صفت کامل بود   زانکہ او را ظاہر و باطن بود
باطنِ او را احد گویند نام   ظاہرش واحد بود عند الکرام
آن احد باشد منزہ از صفات   ہست بیچون او معرا از جہات
واحد آمد متصف او صاف را   جملہ در وے ہست بے چون و چرا
وحدتِ او لا بشرط شے بود   لیک ہر دو گونش شرط شے بود
قوس ظاہر شرط کل اشے بدان   ہر دو عالم زو ہمہ آرد نشان

شہرہا اشیا رجملگی در واحد است ۔ ہم ثبوتے وصف سلبی بے شک است

اس مثنوی مین کل ۱۵۳ اشعار ہین، مگر تخلص کسی جگہ بھی نہین ہے، البتہ ایک شعر مین حضرت عیسیٰ جند اللہ خلیفہ کی جانب جن کے آپ خلیفہ تھے، اشارہ ہے، شعر ہے :-

عیسوی را عشق او بے خود نمود

عشق را بے سود دان اے اہلِ خود[۱]

علالت و وفات آخر عمر مین جب آپ عوارضِ بدنی مین مبتلا ہو گئے، تو بعض اوقات دو دو تین تین دن کے بعد مریدون کو دیدار سے مشرف کرتے، اور کبھی کبھی ایک ہفتہ یا اس سے بھی زیادہ گذر جاتا، مگر حضرت حجرے سے باہر قدم نہین نکالتے، اسی زمانۂ علالت مین ایک دن حضرت نے چند خدام کو خدائے مطلق کے سپرد کیا، اور جو کچھ سامان اور اثاثہ حجرے مین تھا، سب جماعت مین تقسیم کر دیا، یہ پورا اثاثہ پانچ چھ کتابین، اور کپڑون کے چند تھان تھے، آپ کی بیماری کا حال سُن کر سیکڑون آدمی بیعت کی اُمید مین آنے لگے، ایک روز بادشاہ نصیر خان فاروقی والئی برہان پور جو آپ سے بڑی عقیدت رکھتا تھا، مزاج پُرسی کے لئے حاضر ہوا، حضرت نے فرمایا کہ بظاہر تو اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا" آخری سورت[۲] ہے، جو ہمارے پیغمبر آخر الزمان پر نازل ہوئی تھی، نصیر خان حضرت کا منشا سمجھ کر بہت مضطرب ہوا، اور عرض کیا نہین ابھی وہ وقت بہت دور ہے، یہ الفاظ اُس نے کئی مرتبہ دہرائے، اس کے بعد بیماری کی شدت بڑھ گئی، جب خادم تیمارداری کے لئے جاتے تو حضرت کی زبانِ مبارک سے "یک وقت اللہ کافی است" کے الفاظ سنتے،

---

[۱] شہر برہان پور کے مشہور ادیب، ریسرچ اسکالر شیخ فرید الدین صاحب ایم اے جنھون نے احمد آباد جا کر کتب خانہ پیر محمد کی تمام قلمی کتابون کی چھان بین کی ہے، ان ہی نے اس مثنوی کی نقل عنایت کی ہے، جس کا کچھ نمونہ پیش ہے،

[۲] معارف :- یہ سب سے آخری سورت تو نہین ہے، البتہ آخری سورتون مین ہے، جس مین

بالآخر پچاسی سال کی عمر مین ۱۵ ر شعبان ۱۰۸۳ھ کو وصال ہوا، خافی خان منتخب اللباب مین لکھتا ہے، کہ حضرت کے جنازے کے ہمراہ ہزارون آدمی تھے، لیکن غور سے دیکھنے کے باوجود بھی یہ نہین اندازہ ہوتا تھا کہ جنازہ لوگون کے ہاتھون پر جا رہا تھا، یا ہوا مین الگ جا رہا تھا،

قطعاتِ تاریخِ وفات حسب ذیل ہین :-

(۱)

خواہی بدو وجہ رتبہ انسانی ۔ تاریخِ وصال شیخ برحق دانی

برہانِ حقیقت حق او بودہ و بس ۔ حق جوئی بس از حقیقتِ برہانی[۱]
۱۰۸۳ھ ۔ ۱۰۸۳ھ

(۲)

سالِ تاریخ عومش از دنیا ۔ ثبت شدہ بود فخر سلطہا[۲]

حضرت کا مزار پُر انوار محلہ سندھی پورہ شہر برہان پور مین ہے، آپ کی وصیت تھی کہ قبر مبارک پر کسی قسم کا گنبد نہ بنایا جائے، اور نہ عرس و مجلس وغیرہ کیجائے چنانچہ مدت دراز تک مزار مبارک پر کوئی عمارت نہین تھی صرف معمولی کٹھیرہ تھا، ابھی چند سال ہوئے مریدون کے اصرار پر سید ریاض الدین صاحب سجادہ نشین نے ۱۹۴۲ء مین نہایت شاندار گنبد بنوایا، اس مین تین دروازے ہین، مغربی رُخ کے دروازہ سے آمد و رفت ہوتی ہے، مزار کے سامنے مسجد ہے، مزار کا احاطہ نہایت وسیع ہے، جس مین داخل ہونے کے لئے شمالی رُخ پر پھاٹک ہے، عرس کے لئے شاہی زمانہ سے ایک رقم مقرر ہے، جو آجکل حیدر آباد کے خزانہ سے سالانہ آتی ہے، عرس شاندار ہوتا ہے، ہر قوم و ملت کے لوگ شریک ہوتے ہین،

(بقیہ حاشیہ ص ۴۷۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی جانب اشارہ کیا گیا ہے،

[۱] ملفوظات از علم اللہ کمال ۔ [۲] ملفوظات از محمد یوسف،

آپ کے خلف الصدق شیخ عبد العزیز بھی صاحب فضل وکمال تھے اُن کی وفات ۱۱۰۶ھ مین ہوئی،

حضرت عبد العزیز کے دو فرزند کریم اللہ رازی، اور بابا رحمۃ اللہ تھے،

آپ کی ایک خادمہ حرم ماما لالو نامی تھین جو گھر کے تمام کام انجام دیتی تھین، یہ خادمہ بھی صاحبۂ کمال تھین، ان کا مزار موجودہ احاطہ کے باہر مشرقی رُخ کے پھاٹک کے سامنے ایک بلند چبوترہ پر ہے،

آپ کے بے شمار خلفاء تھے، جن مین سے چند مشہور یہ ہین :-

حضرت شاہ نور شکر گنجی، حضرت سید احمد شطاری گجراتی خدانما متوفی ۱۳ر صفر ۱۱۰۹ھ جن کا مزار اورنگ آباد مین ہے، سید محمد شطاری وغیرہ،

شعر العجم جلد چہارم

اس حصہ مین تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ایران کی آب وہوا اور تمدن اور دیگر اسباب نے شاعری پر کیا اثر کیا، کیا کیا تغیرات پیدا کئے، اور شاعری کے تمام انواع واقسام مین سے مثنوی پر بسیط تبصرہ، (زیر طبع)

اُسوۂ صحابہؓ جلد اول

حضرات صحابہ کے عقائد، عبادات، اخلاق اور معاشرت کی صحیح، اور قرون اولیٰ کے اسلام کا عملی خاکہ، (زیر طبع)

منیجر

ادبیات

غزل

از جناب سید علی اختر صاحب تلہری

بوئے گلِ تر ہون مہ و انجم کی ضیا ہون — سب ایک طرف، آپ کا نقشِ کفِ پا ہون

گل گشتِ گلستانِ محبت کو چلا ہون — کانٹے ہین بہت راہ مین اور آبلہ پا ہون

تم آوگے اُجڑا ہوا دل میرا بسانے — اب تک اسی امید کے دھوکے پہ جیا ہون

ہان یاد ہین آغازِ محبت کے کرشمے، — پھولون مین کبھی اور کبھی کانٹون مین رہا ہون

شرمائین نہ سجدہ مجھے کرتے ہوئے قدسی — خاکی ہون مگر حاملِ اسرارِ خدا ہون

کعبہ ہو کہ بت خانہ مجھے کچھ نہین مطلب — مین ناصیہ سائے درِ اربابِ وفا ہون

جس سے کہ ہے دنیا مین یہ سب کیف کا عالم — مین حُسن کے اُس جلوۂ رنگین پہ فدا ہون

منجملۂ اسرارِ خدا ہے مری فطرت — صحرا ہون چمن ہون ابھی کیا تھا ابھی کیا ہون

ذوقِ گل و گلزار ہے اب تک وہی دل مین — ہون گرچہ گرفتار، مگر نغمہ سرا ہون

توفیق طلب پھر ہون ثباتِ شہدا سے — پھر نظمِ دو عالم کو بدلنے مین اٹھا ہون

گرداب کے نظارے سے او کانپنے والے — بپھری ہوئی موجون مین بھی گھِر کر بھی سنبھلا ہون

گر سیلِ حوادث ہے بلا خیز تو کیا ڈر، — مین برق سے آندھی سے سمندر سے لڑا ہون

ہر گام پہ ہین ذوق مین ڈوبے ہوئے سجدے — کس شان سے مین کوچۂ جانان کو چلا ہون

اخترؔ رسن و دار کی مجھ کو نہین پروا — مین گرم روِ راہِ شہیدانِ وفا ہون

آپ کے خلف الصدق شیخ عبدالعزیز بھی صاحب فضل وکمال تھے اُن کی وفات ۱۱۲۶ھ مین ہوئی،

حضرت عبدالعزیز کے دو فرزند کریم اللہ رازی، اور بابا رحمۃ اللہ تھے،

آپ کی ایک خادمہ حرم ماما لالو نامی تھین جو گھر کے تمام کام انجام دیتی تھین، یہ خادمہ بھی صاحبۂ کمال تھین، ان کا مزار موجودہ احاطہ کے باہر مشرقی رُخ کے پھاٹک کے سامنے ایک بلند چبوترہ پر ہے،

آپ کے بے شمار خلفا تھے، جن مین سے چند مشہور یہ ہین:-

حضرت شاہ نور شکر کوٹھی، حضرت سید احمد شطاری گجراتی خدانما متوفی ۱۳ صفر ۱۱۰۹ھ جن کا مزار اورنگ آباد مین ہے، سید محمد شطاری وغیرہ،

شعر العجم جلد چہارم

اس حصہ مین تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ایران کی آب وہوا اور تمدن اور دیگر اسباب نے شاعری پر کیا اثر کیا، کیا کیا تغیرات پیدا کئے، اور شاعری کے تمام انواع واقسام مین سے مثنوی پر بسیط تبصرہ، (زیر طبع)

اُسوۂ صحابہ جلد اول

حضرات صحابہ کے عقائد، عبادات، اخلاق اور معاشرت کی صحیح، اور قرون اولیٰ کے اسلام کا علمی خاکہ، (زیر طبع)

"مینجر"

ادبیات

غزل

از جناب سید علی اختر صاحب تلہری

بوے گل تر ہون مہ و انجم کی ضیا ہون	سب ایک طرف، آپ کا نقش کف پا ہون
گل گشت گلستان محبت کو چلا ہون	کانٹے ہین بہت راہ مین اور آبلہ پا ہون
تم آ دگے اُجڑا ہوا دل میرا بسانے	اب تک اسی امید کے دھوکے پہ جیا ہون
ہان یاد ہین آغاز محبت کے کرشمے،	پھولون مین کبھی اور کبھی کانٹون مین رہا ہون
ثریا مین نہ سجدہ مجھے کرتے ہوئے قدسی	خاکی ہون مگر حامل اسرار خدا ہون
کعبہ ہو کہ بت خانہ مجھے کچھ نہین مطلب	مین ناصیہ ساے در ارباب وفا ہون
جس سے کہ ہے دنیا مین یہ سب کیف کا عالم	مین حُسن کے اُس جلوۂ رنگین پہ فدا ہون
منجملۂ اسرار خدا ہے مری فطرت	صحرا ہون چمن ہون ابھی کیا ہون ابھی کیا ہون
ذوق گل و گلزار ہے اب تک وہی دل مین	ہون گرچہ گرفتار، مگر نغمہ سرا ہون
توفیق طلب پھر ہون ثبات شہداے	پھر نظم دو عالم کو بدلنے مین اٹھا ہون
گرداب کے نظارے سے ادکانپنے والے	بپھری ہوئی موجون مین بھی گھر کر ہنس رہا ہون
گر سیل حوادث ہے بلاخیز تو کیا ڈر،	مین برق سے آندھی سے سمندر سے لڑا ہون
ہر گام پہ ہین ذوق مین ڈوبے ہوے سجدے	کس شان سے مین کوچۂ جانان کو چلا ہون
اختر رسن و دار کی مجھ کو نہین پروا	مین گرم رہ راہ شہیدان وفا ہون

عرفانِ عارف

از جناب عارف عباسی بلیاوی

چشمِ طلب کو حوصلۂ امتحان نہ تھا
ورنہ جمالِ دوست کا جلوہ کہاں نہ تھا

جس جا قدم قدم پہ کوئی امتحان نہ تھا
میری زمین نہ تھی وہ مرا آسمان نہ تھا

دنیا سمٹ گئی تھی جبینِ نیاز میں
سجدہ سے سر اٹھا تو کہیں آستان نہ تھا

دل یوں مٹا کہ لطفِ شکایت بھی مٹ گیا
اب کیا کہیں کہ درد کہاں تھا کہاں نہ تھا

منزل نہ مل سکی بھی تو کیا اے جنونِ شوق
راہِ طلب میں کوئی قدم رائگان نہ تھا

پہنچا دیا جنون نے وہاں جس مقام پر
جز اک نگاہِ شوق کوئی درمیان نہ تھا

عارف جنونِ درد پسندی نے بارہا
ٹھکرا دیا وہ غم جو غمِ جاودان نہ تھا

غزل

از جناب خان بہادر شیخ انعام الرحمٰن صاحب نعمانی ردولوی

یہاں تو ہوش ہی کھونے ہر اک فرزانہ آتا ہے
جو کوئے یار میں آتا ہے وہ دیوانہ آتا ہے

ہے اتنا احترامِ میکدہ ان بادہ خواروں کو
جبینیں خاک پہ رکھتے ہیں جب میخانہ آتا ہے

یہ میخانہ نہیں ہے درس گاہِ کیف و مستی ہے
کہ بیخود ہونے یاں ہر عاقل و فرزانہ آتا ہے

کہیں ایسا نہ ہو سالک بھی اب مجذوب ہو جائیں
کہ میخانہ سے مسجد میں کوئی مستانہ آتا ہے

نفس گم کردہ ہوں یارب سمجھ میں کچھ نہیں آتا
سنبھالوں کس طرح دل کو در جانانہ آتا ہے

بہت رنگین تھی روداد آغازِ محبت کی
مجھے پھر یاد وہ بھولا ہوا افسانہ آتا ہے

جنونِ عشق کی عظمت بڑھانے کو ترے در پر
بصد سامانِ رسوائی ترا دیوانہ آتا ہے

مطبوعات جدیدہ

اسلام کا تمدنی وسیاسی نظام — از جناب پروفیسر نگہت شاہجہان پوری تقطیع بڑی ضخامت [illegible] صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد، پانچ روپیہ، پتہ:۔ کتاب منزل کشمیری بازار لاہور،

مصنف مشہور شاعر، صاحبِ قلم اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، اسلامیات پر بھی اُن کی بعض کتابیں ہیں، یہ کتاب بھی انھوں نے ایک دینی موضوع پر لکھی ہے، اس میں قرآن مجید کی اس آیت وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا، وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ، اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ میں نیکی کے جتنے اجزا بیان کئے گئے ہیں، ان کی تشریح و توضیح اس نقطۂ نظر سے کی گئی ہے کہ مذکورہ بالا آیت اور حقیقت نہ صرف مذہبی بلکہ عقلی حیثیت سے بھی انسانوں کے انفرادی تزکیہ و تطہیر، اُن کے اخلاق و سیرت کی تعمیر، اُن کی اجتماعی اصلاح و ترقی، دینی و دنیاوی فلاح و سعادت اور روحانی و مادی کامرانیوں کا مکمل دستور العمل ہے، اور اس پر عمل ہی سے دنیا کو امن و سلامتی حاصل ہو سکتی ہے، اسی نقطۂ نظر سے آیت کے تمام اجزاء کی حقیقت جزاء یوم آخرت، ایمان، اور ملائکہ کی حقیقت، نظام سرمایہ داری اور تقسیم دولت کا اسلامی نظریہ، صرف دولت کے اجتماعی پہلو، تزکیۂ نفس و نظریۂ عبادت، نماز اور تزکیۂ روح، صرف دولت کے متعلق تعلیم الٰہی کا اجتماعی نظام، پابندی عہد انسانی اور آسمانی معاہدوں کی حقیقت، اور تعلیم الٰہی فلسفۂ صبر اور آسمانی تعلیم کے مختلف مذہبی و سیاسی پہلو، نظریۂ صدق

شرافت اور تعلیم الٰہی کے عنوانوں کے ماتحت بقول مصنف مفکرانہ اور کلچرل تفسیر و تشریح کی گئی ہے، اور ہر بحث کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں پر اس بسط و شرح کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے کہ بقول مقدمہ نگار "مولانا ابو الکلام آزاد نے سورۂ فاتحہ پر ۵۰ صفحے قلمبند فرمائے ہیں، اور مصنف نے ایک آیت کی تفسیر پر تقریبًا پانسو صفحے قلمبند کئے ہیں" صفحہ ۱۳ اس میں شبہہ نہیں کہ شاعر مصنف نے اس کتاب میں صنعت اطناب سے پوری طرح کام لیا ہے، اور جو مسائل سو دو سو صفحون میں لکھے جا سکتے تھے، اس میں انھون نے اپنے زورِ بیان سے چار سو صفحے صرف کر دیئے ہیں، اس کتاب کی دوسری خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ اس میں از اول تا آخر آمد ہی آمد ہے، حال ہی حال ہے، قال اور آورد کا نام نہیں ہے" یہ فقرے، درحقیقت اس کتاب پر نہایت صحیح اور جامع تبصرہ ہیں، اور زورِ بیان کی حد تک بالکل صحیح ہیں: کتاب کے مطالعہ سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ مذکورۂ بالا آیت کی تشریح کے متعلق مصنف کے دماغ میں جس قدر خیالات اور مسائل بھرے ہوئے تھے، ان کو انھون نے شاعرانہ زورِ بیان کے ساتھ کاغذ کے صفحات پر بکھیر دیا ہے، اور اس میں وہ قدیم ماخذوں اور قدماء کی تفسیرون کے بہت کم منت کش ہوئے ہیں، مگر یہ تشریحات و مسائل خالص مفکرانہ نہیں ہیں، بلکہ یہ مباحث اردو کی کتابون خصوصًا سیرۃ النبی حصہ چہارم و پنجم مین بھی موجود ہیں، بہرحال یہ کتاب مصنف کے جذبۂ دینی کی آئینہ دار اور اس حیثیت سے قابلِ قدر ہے، کہ جدید رجحانات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے انھون نے اسلامی تصورات کی جو تشریحات کی ہیں، ان میں ان کا قلم صحیح اسلامی عقائد سے باہر نہیں نکلا ہے، البتہ ختمِ نبوت کے مسئلہ کو انھون نے قادیانیون کی طرح گول اور ذو جہتین لکھا ہے، جس سے دونون پہلو نکل سکتے ہیں، حالانکہ یہ مسئلہ نہایت واضح روشن اور قطعی ہے، جس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں، کتاب کا انداز تحریر خطیبانہ اور موثر ہے، امید ہے کہ اصحابِ ذوق میں مقبول ہوگی،

اسلم اور ان کا ادب، مرتبہ جناب بدر السلام صاحب فروغی تقطیع اوسط، ضخامت ۲۲۶ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت نفیس، قیمت مجلد: للعہ

اردو کے افسانہ نگارون میں جناب اسلم اس حیثیت سے امتیازی درجہ رکھتے ہیں کہ ان کے بیشتر

افسانون کا مقصد اصلاحی و تعمیری ہوتا ہے، اور انھون نے ان کے ذریعہ ہمارے معاشرتی نقائص کی نہایت مفید اصلاحی خدمات انجام دی ہیں، ان کا نقطۂ نظر عمومًا مشرقی اور اسلامی ہوتا ہے، اور انھون نے اپنے افسانون سے وہ کام لیا ہے، جو خشک وعظ و پند کے دفترون سے بھی بمشکل ہو سکتا ہے، انھون نے سیکڑون افسانے اور ناول لکھے اور مشکل ہی سے کوئی افسانہ کسی مفید مقصد سے خالی نکلے گا، اس کے باوجود افسانون کی فنی اور ادبی خوبیون اور افسانوی دلآویزی میں بھی فرق نہیں آنے پاتا، ان کی نگاہ گہری اور مشاہدہ قوی ہے، زبان میں گو کہیں کہیں مقامی اثر کی جھلک آجاتی ہے، لیکن عمومًا صاف اور شستہ زبان لکھتے ہیں، خواجہ بدر السلام صاحب فروغی نے ان کے حالات، عادات، اخلاق سیرت و کردار ادبی و اصلاحی خدمات اور فنی خصوصیات وغیرہ پر مقالات کا یہ مجموعہ شائع کیا ہے، اس میں مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی انتصار حسین صاحب، خواجہ بدر السلام صاحب، مختر تونسوی، شاہد احمد صاحب دہلوی، رضیہ جہان آرا صاحبہ، جاوید اقبال، مرزا احسان احمد صاحب، اشرف صبوحی، سید امداد حسین صاحب رضوی التفت منہاس جرنیل، ڈاکٹر ابو اللیث صاحب صدیقی، ڈاکٹر محی الدین زور قادری کے مقالات و مضامین ہیں، جن میں اسلم کے ذاتی حالات اور ادبی خدمات کی پوری تفصیل آگئی ہے، ان مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلم صاحب محض ایک صاحبِ قلم اور مشہور افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ ایک شریف انسان بھی ہیں، جو ان کا سب سے بڑا وصف ہے، یہ اسلم صاحب کی خوش قسمتی ہے کہ ان کو زندگی ہی میں وہ درجہ حاصل ہو گیا، جو بڑے بڑے مصنفین کو مرنے کے بعد بھی مشکل ہی سے حاصل ہوتا ہے؛ اور ناشر و مرتب بھی، اس حیثیت سے لائق ستائش ہیں کہ انھون نے ایک صاحبِ فن کی قدردانی کا حق ادا کیا ہے، کتاب دلچسپ اور لائق مطالعہ ہے،

ہفت رنگ، از جناب عرش ملسیانی تقطیع اوسط ضخامت ۱۹۲ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ۲ر، پتہ:- رہنمائے بک ڈپو مفتی والان، دہلی، و شیخ محمد اسماعیل پانی پتی دفتر رہنمائے تعلیم رام گلی لاہور،

مصنف مشہور شاعر جناب جوش ملسیانی کے صاحبزادے ہیں، اس لئے شاعری ان کا موروثی ترکہ ہے، ہفت رنگ اُن کے کلام کا اسم بامسمّیٰ مجموعہ ہے، اس میں مختلف جذبات، احساسات اور خیالات و تصورات پرسات رنگ کی نظمیں، غزلیں، اور گیتیں ہیں، ان تمام منظومات میں جدت و قدامت کا بہت خوشگوار اور لطیف امتزاج ہے، اور پورا مجموعہ شاعر کے حسن مذاق، اور مشق و مہارت کی پختگی کا نمونہ ہے، ان کے خیالات ترقی پسندانہ ہیں، اور نظموں کا بڑا حصہ انہی خیالات پر مشتمل ہے، لیکن اس کے باوجود خوش مذاقی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے، چنانچہ یہ نظمیں اگرچہ ترقی پسندی کے رسمی فقرون اور ظاہری لیبل سے خالی ہیں، مگر ان میں اسکی اصل روح پوری طرح موجود ہے اور شاعری کا قالب پرانا ہے، اس لئے کلام میں معنوی محاسن کے ساتھ ظاہری حسن و دلآویزی بھی نمایاں ہے، اور پرانے ساغروں میں بادۂ نو کا رنگ اور نکھر گیا ہے، زبان صاف وشستہ اور انداز بیان دلکش ہے، اور اس حیثیت سے پنجابی عرش کا کلام کسی اہلِ زبان میر فرش سے کم نہیں، غزلوں میں خیالات کی جدت کے ساتھ پوری رنگینی و لطافت موجود ہے، بلکہ مصنف کا اصل اور فطری ذوق تغزل ہی معلوم ہوتا ہے، چنانچہ نظموں میں بھی تغزل کا حسن نمایاں ہے، غرض ہفت رنگ کی بوقلمونی اصحاب ذوق کے دیکھنے کے لائق ہے، البتہ کہیں کہیں ترقی پسندی کے ایک نشان یعنی مذہب پر طعن و طنز نظر آتا ہے، کاش ایسا ستھرا کلام اس دھبے سے خالی ہوتا، یہ غالباً پنجاب کے گذشتہ خونین حوادث کا اثر ہے لیکن غلط کار انسانوں کے اعمال کو مذہب کے سر تھوپنا صحیح نہیں ہے، یہ خرابیاں تو مذہب کا نہیں بلکہ صحیح مذہب سے بے تعلقی کا نتیجہ ہیں،

اسلامی نظمیں از جناب محمد شفیع الدین صاحب نیر استاد جامعہ ملیہ تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۰ صفحے کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت، ار پتہ سنگم کتاب گھر اردو بازار دہلی۔

نیر صاحب بچوں کے مشہور مصنف و شاعر ہیں، مذکورہ بالا کتاب اُن کی بچکانی اسلامی نظموں کا مجموعہ ہے اس میں مختلف مذہبی و اخلاقی موضوعوں پر ۲۴ مفید اور دلچسپ نظمیں ہیں، یہ تمام نظمیں مذہبی تعلیمی حیثیت سے بچوں کے یاد کرانے کے لائق ہیں، زبان سادہ اور سلیس ہے،

"م"

بزم صوفیہ

جس میں عہد تیموریہ سے پہلے کے صوفیۂ کرام حضرت شیخ ابوالحسن علی ہجویریؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ، حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، حضرت شیخ صدر الدینؒ، حضرت بابا گنج شکرؒ، حضرت فخر الدین عراقیؒ، حضرت شیخ امیر حسینیؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، حضرت بو علی قلندر پانی پتیؒ، حضرت شیخ رکن الدینؒ، حضرت برہان الدین غریبؒ، حضرت ضیاء الدین نخشبیؒ، حضرت شرف الدین احمد منیریؒ، حضرت جہانیان جہان گشتؒ، حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ، اور حضرت خواجہ گیسو درازؒ کے مستند حالات اور تعلیمات ایک بالکل نئے انداز میں پیش کی گئی ہیں، ہندوستان کے اسلامی عہد میں جب سلاطین ایک جگہ سے دوسری جگہ فوج کشی میں مشغول تھے، تو خانقاہ کے بوریا نشین انسانوں کے قلوب کی تسخیر کر رہے تھے، رفتہ رفتہ دو متوازی حکومتیں قائم ہو گئیں، ایک تو اُن کی جو تخت و تاج کے مالک تھے، اور ایک ان کی جو روحانی تاجدار تھے، ایک کے یہاں جاہ و حشمت تھی اور دوسرے کے گھر میں فقر و فاقہ تھا، لیکن ان ہی فقر و فاقہ والوں کے ذریعہ ہندوستان میں اسلام کی سچی عظمت و شوکت قائم ہوئی، ان بزرگانِ دین نے اپنے عہد کے مذہب، تصوف، اخلاق، معاشرت اور سیاست کو کس طرح سنوارا، اس کی تفصیل اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیں، قیمت:- ۶ر (مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے)

"منیجر"